زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ وفضیح آنریبل مسٹر جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبۂ

میاں بشیر احمد بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ ایڈیٹر۔
مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر۔

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

دین محمد کاتب لاہور کوتوالی تیلم

فہرستِ مضامین رسالۂ ہمایوں بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — نمبر ۲

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

بزمِ ہمایوں

ہمایوں کا پہلا پرچہ شائع ہونے کے ساتھ جہاں (بدخواہ حاسدوں سے قطع نظر کر کے) اُسے اکثروں کے نزدیک پہلی ہی نظر میں مقبولیت حاصل ہو گئی وہاں ہمیں اس میں بعض ایسی خامیاں بھی محسوس ہوئیں جو بالعموم ہر انسانی کوشش کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں۔ ایڈیٹر، کاتب، اہلِ مطبع، مینیجر سب نے شوق سے کام کیا۔ لیکن بالآخر ہر کام کی تکمیل پر یہ ضرور محسوس کیا کہ اِس میں یُوں ترقی ہوتی تو فُلاں کمی نہ رہ جاتی۔ ہماری کوشش یہی ہے اور کوشش نہیں خواہش ہے کہ ہمیں اپنے کام میں خامیاں نظر آئیں اور پھر مصلحِ حقیقی کی طرف سے اُن خامیوں کے دُور کرنے کی توفیق عطا ہو۔

ہر شخص کا نقطۂ نظر جدا ہوتا ہے اور اُس کے ہر کام کا طرزِ عمل مختلف۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے سرپرست اپنے خیالات و آراء سے ہمایوں کی رہنمائی کرتے رہیں لیکن ہماری طرف سے اُس کے متعلق عمل درآمد کی نسبت یہ بھی نظرانداز نہ کریں کہ مدیرِ رسالہ کی جب تک ایک اپنی رائے یا چند اپنے اصولِ کار نہ ہوں اُس کا کسی اَور کے احساسات و خیالات سے مستفید ہونا نہ صرف بے سُود ہوتا ہے بلکہ ناممکن۔ وہ کشتی جو فضا کے ہر جھونکے یا سمندر کی ہر موج کے ساتھ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ڈگمگاتی پھرے اور اُس کے کھینے والے اُسے اپنے زورِ بازو سے کسی خاص ساحلی مقام یا سیرگاہ کی طرف لے جانے کا مقصد پیشِ نظر نہ رکھتے ہوں بہت جلد اپنے تئیں گردابِ بلا کے ہاتھوں کو سونپ دیگی۔ اس کے برعکس اگر وہ اِس طرح محوِ خرام ہو کہ اپنی حرکت کے ساتھ موجوں کے تھپیڑوں یا ہوا کے تیز جھونکوں سے قوت حاصل کرے تو وہ پہلے کی نسبت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اپنے منتہائے کمال کی طرف سرگرمِ سفر ہو گی۔

یہی طرزِ عمل ہمارا ہونا چاہیئے۔ ہمیں ہر شخص کو خوش کرنا مقصود نہیں۔ ہاں! ہر بامذاق کی بات سُن کر اُس پر غور کرنا اور اپنی عقلِ ناقص کے مطابق اپنے طریقِ عمل پر ازسرِ نو روشنی ڈالنا ہمارے پیشِ نظر ضرور رہا ہے اور رہیگا۔

اِس لحاظ سے ہم اپنے معاونین کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمایوں کو پسند فرمایا اور بعضوں نے ایسے دوستانہ مشورے بھی دئے جو ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہونگے۔

بشیر احمد

جہاں نما

حبشیوں کی بیداری۔ اجتماعی ترقی کے اِس محشرخیز زمانے میں جہاں مشرق و مغرب کی قومیں اپنے اپنے خواب سے بیدار ہو رہی ہیں ناممکن تھا کہ حبشیوں کی کالی کلوٹی نسل محکومیت کی تاریکیوں سے نکل کر آنکھیں ملتی ہوئی تہذیب یافتہ لوگوں کے زمرے میں نہ آملتی! مغربی تہذیب کا قرب اِن لوگوں کے لئے محرکِ اتحاد ثابت ہو رہا ہے۔ وہ اپنی نسل کے لئے ایک بہت زیادہ شاندار مستقبل دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ اُن کی ذکاوت نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے اور وہ انسانی شخصیت کے حقوق حاصل کرنے کے دعویدار ہیں۔ جنگِ عالمگیر نے جہاں دُور دراز ملکوں میں آزادی کے خیالات پیدا کئے وہاں حبشیوں میں بھی خود مختاری کی تحریک کو زیادہ پُرزور بنا دیا۔ صُلح نامے کے بعد ایک افریقی قومی کانگرس بمقام عکرہ (مغربی افریقہ میں) منعقد ہوئی اور آج مشرقی اور وسط افریقہ میں بھی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ حبشی تحریک کا سب سے بڑا مرکز امریکہ ہے۔ یہ حبشی غلاموں کی تجارت کا نتیجہ ہے کہ اِس وقت ممالکِ متحدہ میں ایک کروڑ حبشی آباد ہیں جن کی موجودگی کے باعث "مسئلہ رنگ" نے بہت بھونڈی شکل اختیار کر لی ہے۔

امریکی حبشی تحریکات کے تین بڑے گروہ ہیں۔ حبشی ترقی کی تاریخ میں سب سے بڑی شخصیت بُوکر واشنگٹن کی ہے جو غلامی کے درجے سے بڑھتے بڑھتے حبشی تعلیم کی تحریک کا مقتدر سرگروہ بن گیا۔ اُس کا طرزِ عمل جو سفید قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے پُرصلح اصول پر مبنی تھا ہر دلعزیز نہ ہُوا اور اُس کے اکثر ہم قوم اُسے حکمرانوں کا پروردہ خوشامدی سمجھنے لگے۔ دوسرے طبقے کا سرکردہ مشہور حبشی شاعر دُوبوا ہے۔ جس کی تازہ ترین تصنیف قومی منافرت کا ایک صریح اعلان ہے۔ اسی طبقے کے زیرِ اثر دُوسری کُل افریقی کانگرس منتظم ہُوئی ہے جس کے تین جلسے یکے بعد دیگرے لندن برسلز اور پیرس میں منعقد ہونے والے ہیں۔ تیسرا طبقہ ۱۹۲۰ء میں نیویارک کی کانفرنس میں رُونما ہُوا۔ انتہاپسندوں کی یہ جماعت جن کا لیڈر مارکس گاروی ہے۔ بڑے شدومد سے اِس بات کی تلقین کر رہی ہے کہ افریقہ افریقیوں کے لئے ہے اور اُس تاریک براعظم میں جہاں کسی غیر سیاہ آدمی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں حبشیوں کو اپنی عظیم الشان قومی سلطنت جلد قائم کرنی چاہیئے!

۱۹۲۱ء کا بہترین ادیب - مُلکِ سویڈن سے ہر سال دُنیا کے بہترین ادیب کو سوا لاکھ روپیہ کا بیش قیمت ہدیہ دیا جاتا ہے۔ اسے ادب کا نوبل انعام کہتے ہیں کیونکہ اس کا بانی ایک مُخیّر ایلفرڈ نوبل نامی تھا جو ۱۸۹۶ء میں فوت ہُوا اور جس نے اپنی کمائی کا بیشتر حصّہ پانچ مفید انعامات کے لئے وقف کر دیا جن میں ایک انعام ادب سے متعلق ہے۔ ہمارے سب سے بڑے رُوحانی شاعر ٹیگور نے اسی عطیہ کے ذریعے سے عالمگیر شہرت حاصل کی + ۱۹۲۱ء کا انعام فرانس کے ایک مشہور مُصنّف ژاک آناتول رتیبولٹ کے حِصّے میں آیا ہے جس نے اپنا تصنیفی نام اپنے وطن کی محبت کے جوش میں آناتول فرانس اختیار کیا + وہ ایک کتب فروش کا لڑکا تھا اور اُس کا ادبی مذاق اُن علمی مذاکروں کی آغوش میں پلا جو اُس کے باپ کی دوکان میں ہُوا کرتے تھے۔ اُس کا طرز اُس کی ظرافت اور اُس کی سیرت شناسی لاجواب ہیں اور اُس کی کتابوں کا حقیقی لُطف اُن کے مکالموں میں موجود ہے جہاں وہ اپنی ذکاوت و فراست سے نہ صرف افسانے کے دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے بلکہ ایک زبردست سیرت کا خاکہ آنکھوں کے سامنے کھینچ کر ہمیں ایک زندہ ہستی سے دوچار کرتا ہے + آناتول کی عُمر اس وقت ۷۷ برس کی ہے !

اُس نے اپنے انعام کا سارا روپیہ رُوس کے قحط زدوں کی امداد کے لئے دے دیا ہے باوجودیکہ رُوس اور فرانس برسرِ پرخاش ہیں + ایسے انعاموں کے مُستحق ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں !

دُم دار آدمی - "ارتقائی" حُکما کہتے تو نہیں مگر یقین رکھتے ہیں کہ بنی آدم فی الحقیقت "بنی قرد" ہیں اور ازمنۂ قبلِ تاریخ میں وہ اپنے جدِ امجد کی طرح دُم رکھتے تھے + حال میں ایک مشہور ماہرِ طبیعیات ڈاکٹر لُم ہولس نے جو تھوڑی مُدّت ہُوئی بورنیو سے واپس آیا بیان کیا ہے کہ اُس نے وحشی قوموں کے بہت سے افراد اپنی آنکھوں دیکھے ہیں جن کے اک چھوٹی سی نامکمل دُم تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ظاہرا طور پر یہ لوگ ایک پوری دُم رکھنے والی قوم سے سلسلۂ قرابت رکھتے ہیں + پروفیسر موصوف کو یقین ہے کہ نیوگنی میں دُم دار آدمی موجود ہیں۔ اور اُس کا ارادہ ہے کہ اُس مُلک میں سیر و سیاحت کر کے اس امر کی کماحقہٗ تحقیق کرے + بعض خبروں کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کی دُمیں بارہ سے لے کر اٹھارہ اِنچ تک لمبی ہوتی ہیں اور اُن کے جسم اپنے لمبے گھنے بالوں سے ڈھکے رہتے ہیں + وہ جنگل کے سب سے گنجان مقامات میں رہتے ہیں اور مٹی کے برتن بنانے اور کپڑا بُننے میں مشّاق ہیں۔ جنگ کے واسطے مہلک زہر تیار کرنے میں بھی وہ یدِ طُولےٰ رکھتے ہیں +

جنگ اور رقص - زمانۂ آیندہ کے مؤرخین جب جنگِ فرنگ کی کہانی لکھیں گے تو یہ بھی

بیان کریں گے کہ دنیا کی سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی کے بعد ہمارے دل اور اعضا ناچ کی طرف مائل ہوئے۔ تاریخ کے صفحات اِس قسم کی مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں جس سے قلبِ انسانی کی نفسیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اطالیہ میں ۱۳۷۴ء میں "کالی موت" کے بعد لوگ دیوانہ ہو کر رقص کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دَورانِ جنگ میں سپاہیوں نے جب میدان میں بینڈ باجے کے ساتھ کوچ کرنا سیکھا تو قدرتاً اُن کے قدم ناچ کی حرکتوں کی طرف راغب ہو گئے۔ آج مغربی لندن کا ایک پُرتکلف ہوٹل نہیں جہاں ہر کھانے کے بعد اور درمیان میں ناچ کا جنون انگیز سلسلہ جاری نہ رہتا ہو۔

ایک حیرت انگیز نابینا لڑکی۔ دُنیا کے زندہ عجائبات میں کم ہستیاں اتنی عجوبہ زا ہونگی جتنی امریکی شہر جین وِل کے نابیناؤں کے مشہور اسکول کی طالب علم لڑکی ولیٹا ہگنز۔ ولیٹا کی عُمر اِس وقت سولہ برس کی ہے۔ وہ مادر زاد نابینا نہیں بلکہ صرف چند سال ہُوئے اپنی دیکھنے اور سُننے کی قوتیں قطعی طور پر کھو بیٹھی۔ اس تغیر سے پہلے وہ بدمزاج خاموش اور غمگین رہا کرتی تھی لیکن بہری اور اندھی ہونے کے ساتھ ہی اُس کی طبیعت میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہُوئی اور آج اُس کی بات بات سے چالاکی ذکاوت اور خوش طبعی ٹپکتی ہے۔ قدرت کی بعض نعمتوں سے محروم ہو کر اُس کی فطرت اپنی پوری قوت میں رونما ہُوئی۔ ولیٹا نے دوسرے کے سر پر ہاتھ رکھ کر سُننا اور چیزوں کو سونگھ کر "دیکھ لینا" اور رنگوں کی صحیح صحیح شناخت کرنا شروع کیا۔ ایک روز اسکول کی مہتمم چند دلچسپی لینے والی خواتین کے سامنے اِس "بینا" نابینا کو باغیچے میں لے گئی اور اُسے درختوں کے ایک جھُنڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ دیکھنے والیاں حیرت زدہ ہوگئیں کہ وہ رستے میں آنے والے درختوں سے صاف بچتی ہُوئی بے دھڑک چلتی گئی۔ ایک خاتون نے اک پھُول توڑ کر اُس کے ناک کے قریب رکھا اور پوچھا یہ کس رنگ کا ہے۔ فوراً جواب مِلا "سفید"۔ وہ گانے بجانے کی مشاق اور سینے پرونے میں ماہرِ فن ہے۔ اُس کا لباس اُس کے ہاتھوں کا سِلا ہوتا ہے۔ اس زندہ مثال سے صاف طور پر عیاں ہے کہ ہماری دیکھنے سُننے چھُونے اور سُونگھنے کی قوتیں ایک دوسری کی جگہ کام دے سکتی ہیں اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر فردِ بشر کی خوشی اور ترقی کا بہترین ذریعہ اپنے ہم جنسوں سے کھُلے طور پر آزادانہ تعلقات قائم کرتا ہے۔

بشیر احمد

علمی شعاعیں

اسرارِ نجوم۔ ہیئت دان ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ننھی ننھی ہستیاں جو ہمارے تاروں بھرے آسمان کی زیب و زینت ہیں اپنے ظاہرہ ننھے پن کے ساتھ حقیقت میں ایسی ہیبت ناک جسامت رکھتی ہیں کہ اُس کے صحیح صحیح اندازے کا احساس ہی ہماری ذہنی قوت کو فنا کر دینے کے لئے کافی ہے۔ سورج ہم سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے لیکن ارقتورس ایک نامعلوم سا تارہ جو ہمارے نیّرِ اعظم سے دس ہزار گنا بڑا ہے ہم سے اتنی مسافت پر واقع ہے کہ روشنی کی ایک کرن جو وہاں سے ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہوئی آج زمین کی طرف سرگرم سفر ہو ہمارے ہاں سنہ ۱۹۴۴ء کے موسمِ بہار میں پہنچے گی۔

دھاتیں بھی تھک جاتی ہیں۔ یہ امر مُدت سے دریافت ہو چکا ہے کہ دھاتیں بھی انسان کی طرح مسلسل محنت و مشقت سے مضمحل ہو جاتی ہیں مثلاً دھات کا ایک ٹکڑا جو دیر تک برابر جنبش میں رہے بتدریج اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر اُسے تھوڑا آرام مل جائے تو وہ ازسرِنو اپنی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے انجنیر دھاتوں کی تھکن کا اندازہ لگانا بہت ضروری جانتے ہیں۔ وہ کسی دھات کی سختی یا لچک کا اتنا خیال نہیں کرتے جتنا اس بات کا کہ وہ کس درجہ پر چُور ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اِس تھکن کا اندازہ کرنے کے جو طریق پہلے رائج تھے اُن میں بڑا نقص یہ تھا کہ آزمایش میں بہت وقت اور نتیجتاً زرِ کثیر صرف ہوتا تھا۔ حال میں ایک آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے دھاتوں کی تھکن کا صحیح صحیح اندازہ بجائے ایک دو ہفتے کے چند ہی منٹ میں کر لیا جاتا ہے۔ (ب)

انسانی زندگی کے پچاس برس۔ ایک فرانسادی ماہرِ اعداد و شمار نے اندازہ کیا ہے کہ پچاس برس کے ایک آدمی کی عُمر اوسطاً اِس طرح صرف ہو چکتی ہے:۔

سونا	۶۰۰۰ دن	کام کاج	۶۵۰۰ دن
چلنا پھرنا	۸۰۰ دن	سیر تماشہ	۴۰۰۰ دن
کھانا پینا	۱۵۰۰ دن	علالت	۵۰۰ دن

وہ دو سو دس من ترکاری انڈے اور مچھلی کھا چکتا ہے اور پانچ سو چھتیس من مائعات پی چکتا ہے۔

پچاس برس کے ایک غریب ہندوستانی سے پوچھئے کہ اُس کی اوسط کتنی ہے؟ (دلّی)

موسیقی کے ذریعہ علاج - ڈاکٹروں کی نظر میں موسیقی بہت وقعت حاصل کر رہی ہے بعضوں نے تو عصبی امراض کے معالجہ میں موسیقی کو بطورِ دوا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ موسیو فروسار فرانسیسی نے فونوگراف کے مخصوص طریقہ کے ذریعہ بعض مریضوں کا علاج کیا اور یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہُوا۔ اس کی رائے میں غنا (گانا) کا اثر تنشیطِ جسم ہی تک محدود نہیں بلکہ اعصاب میں اس کا اثر حیرت انگیز طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ موسیو موصوف نے بہت سے مریضوں کا علاج صرف موسیقی و غنا کے ذریعہ کیا اور وہ بالکل شفایاب ہُوئے۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی امراضِ عصبیہ۔ بیخوابی۔ اختلاج قلب وغیرہ کے لئے بہت مفید ہے ❊

الہلال (مصر)

۲۴ دسمبر کے ایک لندنی اخبار میں کسی کسان کا یہ قول شائع ہُوا ہے کہ جس روز میری گائیں اتفاقی طور پر کسی ایسی جگہ جا نکلتی ہیں جہاں محفلِ سرود گرم ہو تو شام کو اَور دنوں کی نسبت دودھ زیادہ دیتی ہیں ❊

کیا آفتاب کی حرارت تغیر پذیر ہے؟ علمائے ہیئات کی رائے ہے کہ دو ہزار سال سے اب تک آفتاب کی حرارت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہُوا۔ اسی لئے کرۂ ارض پر حیوانات و نباتات کی پیدائش غیر متغیر نظر آتی ہے لیکن دو ہزار سال سے قبل حرارتِ آفتاب کی مقدار میں عظیم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے جیالوجی (علم طبقات الارض) کے عظیم انقلابات رونما ہُوئے۔ بعض فلاسفہ کی رائے ہے کہ آفتاب کا جِرم تدریجی طور پر کم ہو رہا ہے اور ایک لاکھ برس کے بعد آفتاب کا یہ دہکتا ہُوا کرہ بجھ جائیگا۔ حتیٰ کہ حرارت کی کمی کی وجہ سے سطحِ زمین سے حیوانات و نباتات یکقلم فنا ہو جائینگے ❊ الہلال (مصر)

اس کے برخلاف یورپ کی مشہور فلسفیہ مادام کوری کا خیال ہے کہ آفتاب کی حرارت کم ہونے کی بجائے ترقی پذیر ہے"

بہرحال آفتاب کی حرارت ترقی پذیر ہو یا تنزل قبول دنیا کا مستقبل خطرہ ہی میں ہے"❊ (تاجور)

نئے ہوائی جہاز - صلح نامہ درسائی کی رُو سے جرمنوں کے لئے انجن والے ہوائی جہازوں کا بنانا ممنوع قرار دیا گیا لیکن اُن کی ایجاد کاری اک دوسری شکل میں نمودار ہُوئی۔ حال میں رُون کے علاقے میں ایک پروازی مقابلہ ہُوا جس میں ۴۵ بے انجن اُڑنے والے ہوائی جہازوں نے حصہ لیا۔ ایک ہوا پرواز تیرہ منٹ ہوا میں اُڑتا رہا اور اتنی دیر میں اُس نے چھ میل کا فاصلہ طے کر لیا ❊

علم الکیمیا۔ حال کے سائنس دان قدیم علمِ کیمیا پر یقین رکھنے والوں کی پھبتی اُڑاتے آئے ہیں۔ لیکن گذشتہ دسمبر میں یورپ کا دماغ یہ سُن کر ہیجان کی حالت میں آگیا کہ ایک جرمن نے مصنوعی طریق سے سونا بنالیا ہے۔ اتحادی ایک دوسرے سے پُوچھنے لگے کہ کیا جرمن اپنا تاوان ادا کرنے میں ایسی ذلیل حرکت سے باز نہ آئیں گے۔ جرمنی کے متین طبقے کی طرف سے اِس بات کی تردید ہوگئی لیکن یقین نہیں آتا کہ یہ بات صرف تفننِ طبع کی غرض سے کی گئی تھی۔

بالنس کی گھڑی۔ سینئر رینزی (ساکن نیپلز) نے تین برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک بالنس کی بڑی گھڑی ایجاد کی ہے جس میں سوائے گھنٹی کے سب پُرزے بالنس کے بنے ہوئے ہیں۔ اس میں گھڑی کے معمولی کام کے علاوہ بعض نئی باتیں ہیں۔ گھڑی ہر پندرہ منٹ کے بعد بجتی ہے۔ دن اور مہینے کا پتہ دیتی ہے اور اُسے صرف چار برس کے بعد چابی دی جاتی ہے۔ ہر روز دوپہر کے وقت اُس میں ایک چھوٹی سی توپ چلتی ہے ایک جھنڈا بلند ہوتا ہے اور ایک سیٹی کے بعد ایک گھنٹی بجتی ہے۔

اخلاق پیمائی۔ ڈاکٹر برڑسے (برلن) نے ایک فلزی آلہ ایجاد کیا ہے جس سے تھوڑی دیر میں انسان کی اخلاقی قوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ آلہ معمول کے سر پر لگادیا جاتا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر اُس شخص کی اچھی بُری عادتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ (ٹ)

امریکہ کے مشہور ہواپرواز مسٹر ایڈون نے اعلان کیا ہے کہ میں قطبِ شمالی کے سفر کی تیاری کر رہا ہوں یہ سفر الیاسکا (شمالی امریکہ) سے شروع ہوکر قطب کو کاٹتا ہوا "سبتیز برجن" پر ختم ہوگا یعنی اٹھارہ سو میل کی مسافت طے کرنی ہوگی اور پھر طرّہ یہ کہ اتنی بڑی مسافت ایک ہی پرواز میں قطع کی جائیگی۔

الہلال (مصر)

دُنیا میں سب سے زیادہ بلند پرواز ایک امریکن باشندہ مسٹر میکریڈی ہے جو اکتالیس ہزار قدم اونچا اُڑ سکتا ہے اور سب سے زیادہ زُود پرواز موسیو کوانٹ فرانسیسی ہے جو (۲۰۶) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتا ہے۔

(تاجد) الہلال (مصر)



انقلابِ فرانس

اٹھارھویں صدی کے نصفِ آخر میں مغرب کا بحرِ سیاست جو کچھ مُدت سے گویا سکونِ مُطلق کی تصویر ہو چکا تھا اب ایک ہیبت انگیز طوفان کی فتنہ سامانیوں کا نظارہ بن گیا! یہ طوفانِ بے تمیزی جسے مورخین "انقلابِ فرانس" کہہ کر یاد کرتے ہیں اوّل اوّل پیرس سے اُٹھا اور پھر آن کی آن میں سارے براعظم پر پھیل گیا!

قومی انقلابات خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی اپنے اندر ایک غیر معمولی اٹل قوت رکھتے ہیں۔ وہ قوت جو اپنے عہد کی اخلاقی اور تمدنی کمزوریوں میں جنم لیتی ہے اور پھر خود اِن جراثیم کی تباہی کا موجب بن کر نظامِ ہستی کو اِک نئی زندگی بخشتی ہے!

یہ پُر اضطراب تبدیلیاں قانونِ قدرت کے معمول سے ہیں جو کارخانۂ حیات کی کلوں کو کبھی ایک حالت پر نہیں رہنے دیتا بلکہ دائمی حرکت کے ذریعے اُس کے پُرزوں میں بے قراری کی لہریں پیدا کرتا ہے۔ اور مادۂ نیم جاں کو رُوحانی قوت کے زور سے عمل کی طاقت بخشتا ہے!

جب "انقلابِ فرانس" برپا ہُوا یورپ خوابِ غفلت میں مدہوش تھا!

اکثر شاہانِ مغرب اپنی مُطلق العنانی کے نشے میں چُور تھے اور مُلک کا خزانہ اپنے شاندار درباروں اور پُر عشرت محفلوں میں پانی کی طرح بہاتے تھے۔ اُمرا اپنے موروثی جاگیرداری حقوق پر جمے بیٹھے تھے اور اگرچہ عام طور پر اختیارِ شاہی کے آگے اُن کا چراغ نہ جلتا تھا لیکن خود شاہانہ اقتدار ہی اُن کی آتش افروزیوں کو اپنا فروغ سمجھے ہُوئے تھا!

جرمنی میں مزارعان کی حالت خراب و خستہ تھی۔ وہ غلاموں سے بڑھ کر درجہ نہ رکھتے تھے۔ فرانس میں بھی وہ حقوقِ جاگیرداری کے آئے دن کے مطالبات سے تنگ آ گئے تھے۔ اُن کا جاگیردار اگر سیر و شکار میں مصروف ہے تو کیا مجال کہ اپنی کھیتی باڑی کی تباہی پر وہ ناک بھوں چڑھائیں۔ اُن کی محنت کا پھل جاگیردار کے شغل و عیش کی قربان گاہ پر بطورِ نذر پیش ہو جاتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک صرف غم و مایوسی کی نگاہوں

دیکھتا رہتا ہے کہ ہاں میرا مقدر یہی ہے!

طبقۂ اسفل کے احساسات

لیکن تابکے؟ طبقۂ اسفل کبھی ہمیشہ کے لئے دبا نہیں رہتا! جہاں وہ اپنے زندہ رہنے کے حق و اختیار کو محسوس کرنے لگے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ موروثی عشرتیں بے رحمی کے ساتھ انسانیت کی بیخکنی کر رہی ہیں تو وہ ایک زلزلے کی مانند اُٹھتا ہے اور بجلی سے بھری ہُوئی گھٹاؤں کی طرح چار دانگ عالم میں چھا جاتا ہے۔ پھر اُسے یہ ملحوظ نہیں رہتا کہ اُسے صرف اپنی گذشتہ ناکامیوں کی تلافی کا استحقاق حاصل ہے بلکہ وہ قلبِ انسان کے اس زہریلے پن کے ساتھ جسے فطرتِ انسانی فخر کے ساتھ اِنتقام کا لقب دیتی ہے اپنے ہمجنسوں کی ہلاکتِ عام کا تہیّہ کر لیا ہے! اِس طرح معاشرت کے ترازو کا کبھی ایک پلڑا بھاری ہو جاتا ہے کبھی دُوسرا! اور اگرچہ طبقۂ اسفل اکثر نیچا نظر آتا ہے لیکن تاریخِ دُنیا گردش کی اُن مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں فاقہ مستوں نے صرف اپنے حقِ زیست کو نہیں بلکہ اپنے حقِ حکومت کو بھی بزورِ شمشیر ثابت کیا ہے۔ ''انقلابِ فرانس'' اس فطری احساس کا ایک لاجواب اظہار تھا۔

انقلابِ فرانس کے اہم اثرات

یہ اِسی انقلاب کی وجہ ہے کہ آج دُنیا ہمیں اپنی موجودہ حالت میں نظر آتی ہے اور جہاں جہاں بنی نوعِ بشر آباد ہیں وہاں جمہوریت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ہر قوم اپنے مُلک میں اور ہر فرد اپنے گھر میں اپنے فطری حقوقِ خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ خود سری اپنی صورت دکھاتی ہے تو سب فریق مل کر اُس کی سرکوبی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی عقل و توجیہ کا دلدادہ ہے اور ہر قسم کی بزرگی اپنی سند کو کھو بیٹھی ہے!

اگر ''انقلابِ فرانس'' برپا نہ ہُوا ہوتا تو ہماری بیسویں صدی کی دُنیا اٹھارھویں صدی کے زمانے سے اِس قدر مُختلف نہ ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''انقلابِ فرانس'' وہ حجاب ہے جو قدیم زمانوں کو ہماری سیاسی اور معاشرتی دُنیا کی نگاہوں سے چھُپائے ہُوئے ہے!

یہ درست ہے کہ اس انقلاب کے بعد بھی اُنیسویں صدی میں اِستبداد نے اپنا سر اُٹھانے سے دریغ نہیں کیا لیکن ہر ایسی حالت میں تھوڑی مُدت کے بعد ہی اُسے قوتِ جمہور کے سامنے اپنا سر جُھکانا پڑا۔ خود ہمارے وقت میں بھی مغربی قوموں نے مشرقی اور افریقی ملکوں کو فتح کر کے اپنی آرام گاہوں میں تبدیل کر لیا ہے لیکن اُن کی زمانہ شناسی اور اُن کا وسیع تجربہ اُنہیں بتا رہا ہے کہ یہ بیرونی حکومت اُسی

وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک یہاں کے باشندوں میں اپنی قدرتی حق طلبی کا احساس اور اپنی فطری ذمہ داری کا خیال مفقود ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جس روز یہ لوازماتِ حریت پیدا ہونگے دُنیا کے یہ حِصّے بھی محکومیت کی بندشوں سے آزاد ہو جائیں گے!

انقلابِ فرانس کے اسباب

یہ انقلابِ عظیم جس نے یُوں مہذب دُنیا کی کایا پلٹ دی کیونکر وقوع میں آیا؟ اِس کے اسباب نہایت دلچسپ اور اُن قوموں کے واسطے جو آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں انتہا درجہ معنی خیز ہیں!

۱۷۸۹ء سے پہلے یورپ میں اکثر قوموں نے اپنے موجودہ جغرافی حدود قائم کر لئے تھے۔ لیکن اِنسانی معاشرت کے طبقے ہنوز اپنی پُرانی حالت میں پڑے تھے بالخصوص نچلا طبقہ جو صدیوں سے ایک طرف شاہی مُطلق العنانی اور دوسری طرف جاگیرداری تمول کے ناقابلِ برداشت ظُلموں کے درمیان دب کر اپنی فطری صُورت کھو چکا تھا!

اِن مغربی قوموں میں فرنسادی لوگ نہایت جفاکش اور تیز فہم ہونے کے ساتھ انتہا درجہ ذکی الحس واقع ہُوئے ہیں۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے پہلے پہل اس طبقاتی امتیاز کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور یہی لوگ تھے جنھوں نے یکبارگی اس کا قلع قمع کر دینے کا مصمم اِرادہ کر کے اُس کو جڑ سے اُکھیڑ دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

قُرونِ وسطیٰ میں اور "اصلاحِ مذہبی" کے دَور میں بمقابلہ اور مغربی مُلکوں کے فرانس میں شاہی مُطلق العنانی اپنے زوروں پر تھی لیکن اٹھارھویں صدی میں خاندانِ بُوربون کے جانشینوں میں وہ سیاسی فطنت اور اوصافِ مُلک داری باقی نہ رہے تھے جو فرنسادی فرماں رواؤں کی امتیازی خصوصیت سمجھے جایا کرتے تھے۔

"انقلابِ فرانس" کے وقت فرانس میں اِدھر درباری اِسراف اور شاہانہ عشرت کا بدنما پہلو پیشِ نظر تھا اور اُدھر مُلکی نظم و نسق کی حالت ابتر تھی اور قومی خزانہ قطعی خالی!

اِس پر امریکہ اور ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں پے در پے شکستیں اُٹھانا گویا بجھتی شمع کے لئے ایک تند و تیز جھونکے کا کام دے گیا۔ مُطلق العنان بادشاہ اور اُس کے چیلے چانٹے وہ اُمرا جن کے حقوق کی پرستش سے رعایا بیزار ہو چکی تھی جس طرح اُنھوں نے ایک دوسرے کی حمایت و اعانت سے نشو و نما پائی تھی اب اُسی طرح ایک دوسرے کی مصاحبت میں لوگوں کے جوشِ انتقام کا نشانہ بنے!

شاہی خاندان کا اسراف اور بے اعتدالیاں۔ اُمرا اور پادریوں کے نامُنصفانہ امتیازی حقوق، غریبوں اور طبقۂ متوسط کے لوگوں کی ناگفتہ بہ حالت، فرنساوی فلسفہ و ادب کی جوش انگیزی، امریکہ کے جنگِ انقلابی کا اثر! یہ تھے وہ اہم اسباب جو "انقلابِ فرانس" کی تحریکِ بلاخیز کا موجب ہُوئے۔



لوئی شانزدہم

جب لوئی پانزدہم کی وفات پر ۱۷۷۴ء میں اُس کا بیٹا لوئی شانزدہم تخت پر بیٹھا تو مالی مشکلات نے اہلِ حکومت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آخر کار (۱۷۸۷ء میں) بادشاہ نے "مجلسِ خوانین" کو جمع کیا اور جب اِس سے کچھ بن نہ پڑا تو طوعاً و کرہاً فرنساوی قوم کی قدیم "مجلسِ شُوریٰ" کے انتخاب کا حُکم دیا یہ خیال کر کے کہ شاید قوم کے چھوٹے چھوٹے مطالبات کے ساتھ شاہی خزانے کی بڑی ضروریات بھی پُوری ہو جائیں۔

مجلسِ شُوریٰ مدعوہ کی گئی

انتخاب کنندوں کو ہدائیت دی گئی کہ اپنے اپنے نمائندوں کو اپنی شکایات اور تجاویزِ اصلاح کے متعلق تحریری بیانات دیں۔ ایک مطالبہ اِن سب بیانوں میں مشترک پایا جاتا ہے کہ قوم کو اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت میں حصّہ لینے کا حق دیا جائے۔ "طبقۂ سوم" یا طبقۂ زیرین کی شکایات زیادہ تر جاگیرداری حقوق و خدمات کے متعلق تھیں اور نیز اِس بات پر اصرار تھا کہ سب طبقوں میں بارِ محصولات یکسانیّت کے اصول پر مبنی ہو!

یہ مجلس ۱۷۵ سال سے مدعو نہ کی گئی تھی۔ بادشاہ نے مجلس کا افتتاح کیا اُس وقت اُسے گُمان تک نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے جی میں کیا کیا ہوسیں لے کر آئے ہیں؟

"عوام" کے اصرار پر اُنہیں چھ سو نمائندے بھیجنے کا حق عطا کیا گیا تھا۔ پادریوں اور اُمرا کے تین تین سو نمائندے تھے۔ اب "عوام" نے خلافِ دستور مطالبہ کیا کہ ہر سوال پر طبقہ طبقہ رائے نہ دے۔ بلکہ سب نمائندے یکجا جمع ہو کر انفرادی طور پر رائے دیں۔ ظاہر ہے کہ اِس طریقہ سے عوام کسی بات میں زک نہ اُٹھا سکتے تھے بلکہ بوجہ اُسی ہمدردی کے جو دوسرے طبقوں کے بعض نمائندے اُنکے خیالات کے ساتھ رکھتے تھے وہ اکثر معاملات میں بازی جیت لیتے۔ اس غیر معمولی مطالبہ پر برابر پانچ ہفتے بحث

مجلسِ شُوریٰ مجلسِ قومی بن گئی

کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار "عوام" نے خود بخود "مجلسِ قومی" ہونے کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ اُمرا اور پادری سب اِس بے باکانہ

کارروائی پر ششدر رہ گئے۔ بادشاہ نے خوف زدہ ہو کر مجلس کو معطل قرار دیا اور ایوانِ مجلس کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر سنگین پہرہ کھڑا کر دیا۔ "عوام" نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور ٹینس کورٹ میں جمع ہو کر حلف اُٹھایا کہ جب تک ہم فرانس کے واسطے ایک دستورِ حکومت مرتّب نہ کر لیں گے ہم ہر گز منتشر نہ ہونگے۔ چند اُمرا اور بہت سے پادری اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر سب نمائندوں کا مشترک جلسہ کیا اور پھر ہر طبقہ کے نمائندوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ایوانوں میں چلے جائیں۔ اُمرا اور پادری اُٹھ کر چلے گئے لیکن "عوام" اپنی نشستوں پر قائم رہے۔ میرِ رسوم نے بڑھ کر ذرا تحکمانہ انداز میں کہا "تم نے بادشاہ کا حکم سُن لیا" میرابو نے ان مشہور الفاظ میں اُس کو جواب دیا "جاؤ اور جن لوگوں نے تم کو بھیجا ہے اُن سے کہہ دو کہ ہم لوگ عوام الناس کے حکم سے یہاں موجود ہیں اور یہیں جم کے بیٹھیں گے حتّیٰ کہ سنگینوں کے زور سے ہم کو باہر نکال دیا جائے" بیچارہ پیغام رساں جو اس باختہ ہو کر واپس چلا لیکن پیٹھ موڑ کر نہیں بلکہ پچھلے قدموں جیسے وہ بادشاہ کے حضور رخصت ہوا کرتا تھا۔ اُس کا اِدراک درست تھا۔ وہ فی الحقیقت فرانس کے اک نئے فرماں روا کے دربار میں موجود تھا جس نے ابھی ابھی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ یہ جان کر کہ اب ان کا مقابلہ دشوار اور خطرناک ہو گا بادشاہ نے اُن امرا اور پادریوں کو جو ابھی تک "عوام" سے الگ رہے تھے حکم دے دیا کہ اُن کے ساتھ شریکِ مجلس ہو جائیں۔ مجلسِ شوریٰ اب واقعی مجلسِ قومی بن گئی!

مجلسِ دستوری

"مجلسِ قومی" کو "مجلسِ دستوری" بھی کہتے ہیں کیونکہ اِس کا صریح مقصد فرانس کے لئے ایک مناسب دستورِ حکومت بنانا تھا۔ اس کے ہوتے سب سے پہلے پیرس میں "قومی محافظین" اور پیرس کی "انقلابی جماعت" کا ظہور ہوا۔ ۱۴ جولائی کو عوام الناس نے شاہی قید خانے باستیل پر دھاوا کیا اور قیدیوں کو رہائی دے کر دیواروں کو قطعاً منہدم کر دیا۔ لوئی شانزدہم نے سُنا تو غصہ و حیرت سے چلّا کر کہا "کیا؟ یہ بغاوت ہے؟" جواب ملا "نہیں! جہاں پناہ! یہ قومی انقلاب ہے!" عظیم الشان "انقلابِ فرانس" واقعی شروع ہو گیا تھا۔

"انقلابِ فرانس" کی تاریخ ہمارا موضوع نہیں۔ یہاں صرف تمہیداً اُس کا مختصر طور پر ذکر کرنا مقصود ہے۔ اُمرا کے حقوقِ خاص کی منسوخی۔ "اعلانِ حقوقِ انسان" اراضیاتِ کلیسائی کا قومی جائداد بنایا جانا۔ پادریوں کا دستورِ دیوانی۔ بادشاہ کا فرار اور گرفتاری ہم اِن مشہور داہم واقعات کے ذکرِ محض پر اکتفا کرتے ہیں!

مجلسِ آئینی مجلس کے نئے دستور کے مطابق جس پر بادشاہ نے اپنی منظوری کی مُہر ثبت کردی تھی یکم اکتوبر ۱۷۹۱ء کو "مجلسِ آئینی" کا آغاز ہوا۔ نمائندوں میں ایک گروہ کا منشا تھا کہ فرانس میں نئی دُنیا کی سی جمہوری حکومت قائم کرے۔

شاہانِ یورپ نے لوئی شانز دہم کے معاملے کو اپنا معاملہ اور اُس کے تاج چھن جانے کو اپنے اپنے تخت کا اُلٹ جانا تصور کیا۔ آسٹریا کی جنگی تیاریوں کو دیکھ کر "مجلسِ آئینی" نے اُس دولت کے خلاف لڑائی کا اعلان کردیا۔ تھوڑی مُدت بعد آسٹریا اور پرشیا کی متحدہ فوجیں سرحد کو عبور کرکے فرانس میں داخل ہُوئیں۔ انقلابی گروہ آگ بگولا ہوگیا اور سب سے پہلے اُس نے مُلکی دشمنوں کے قلع قمع کرنیکا ارادہ کیا۔ دانتوں نے کہا کہ "دُشمن کو روکنے کی بہترین ترکیب شاہی طرفداروں کی سرکوبی ہے"۔ اِس طرزِ خیال کا نتیجہ سُوئس گارڈ کا قتلِ عام اور ستمبر کی خونریزیاں تھیں۔ ساتھ ہی اتحادیوں کو بمقامِ والمی شکست ہُوئی اور اُسی روز مجلسِ آئینی کا دَور ختم ہُوا۔

مجلسِ مدعوہ اِس مجلس میں کوئی طرفدارِ شاہی نہ تھا۔ سب جمہوریئے تھے جن میں دو سیاسی گروہ تھے ایک جرونڈی اور دوسرے کوہستانی۔ ۲۰ ستمبر کو نئی مجلس کی پہلی نشست ہُوئی ۲۱ کو جمہوریہ کے قائم کئے جانے کا اعلان کیا گیا اور ۲۲ کو ایک نئے دَور کا آغاز ہوا یعنی وہ جمہوری "سالِ اول" کا پہلا دن قرار پایا۔ تھوڑی مدت بعد فرنساوی فوجوں کی کامیابی سے مغرور ہوکر "مدعوہ" نے اقوامِ دُنیا کو مطلق العنانی کے خلاف اپنا اپنا جھنڈا بلند کرنے کی دعوتِ عام دی اور ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا۔ یعنی اب دُنیائے مغرب کے قدامت پسندوں اور جدّت طرازوں کے درمیان ایک عظیم الشان خونریز جنگ کا آغاز ہوگیا۔ شاہِ فرانس پر قوم کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا اور ۲۱ جنوری ۱۷۹۳ء کو اُسے موت کی سزا دے کر گلوتین کردیا گیا۔ اِس واقعہ سے برہم ہوکر دُولِ یورپ نے ایک اتحادِ عظیم قائم کیا جس میں انگلستان آسٹریا پرشیا اور دیگر ریاستیں شامل تھیں۔ اِس "اتحادِ اول" کا صریح مقصد جمہوری تحریک کا ملیامیٹ کرنا اور فرانس میں شخصی حکومت کا استحکام تھا۔

فرنساوی فوجیں شمال میں شکستیں کھاکر پیچھے ہٹیں تو اہلِ پیرس نے اس بات پر زور دیا کہ ایک "انقلابی عدالت" قائم کی جائے جو مخالفینِ جمہوریہ کی سازشوں کا سدِ باب کرے اور اُن کو بلا تامل سنگین سزائیں دے۔ چند ماہ کے بعد ایک "حفاظتِ عامہ کی کمیٹی" مقرر کی گئی جسے اِس قدر وسیع اختیارات

دئے گئے کہ فرانس میں گویا نادر شاہی دور کا آغاز ہو گیا۔ جرندیئوں نے اِن انتہائی کارروائیوں کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا اور نتیجتاً وہ کوہستانیوں کے آگے اپنا سب اثر اور طاقت کھو بیٹھے۔

آشوبِ فرانس مُلکی سازشوں اور اجنبی دشمنوں کے حملوں نے ایک نازک سیاسی حالت پیدا کر دی تھی۔ "مجلسِ مدعوہ" نے "حفاظتِ عامہ" کی کمیٹی کو از سرِ نو ترتیب دیا اور اُس کا نام "حفاظتِ عامہ کی بڑی کمیٹی" رکھا گیا۔ پُورے بارہ مہینے تک بارہ شخصوں نے جو اس کمیٹی کے رُکن تھے اور جن میں روبس پیئر ممتاز تھا فرانس کے ہر فرد کے جان و مال پر نادر شاہی اختیارات برتے۔ کمیٹی کا اصول صاف و صریح تھا "سختی و سفاکی" کے ذریعے انہوں نے فرانس کے رگ و ریشے میں بیقراری کی لہر پیدا کر دی اور اُسے غیر مُلکیوں اور مخالفینِ جمہوریہ کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ ملکہ ماری انتوانت اور جروندیئوں کا قتل اور اُن کے بعد مادام رولاں اور پھر اَور ہزاروں بے گناہوں کا ہر روز خون بہایا جانا رقت انگیز واقعات تھے۔ لیکن ان سے بڑھ کر حیرت افزا وہ جدتیں تھیں جو زندگی کی عام معاشرت میں کی گئیں۔ سنِ عیسوی تو "مجلسِ مدعوہ" نے منسوخ کر ہی دیا تھا۔ اب سال کے مہینوں نے نئے نام حاصل کئے۔ ہر مہینہ دس دس دن کے تین عشروں میں اور ہر دن دس دس گھنٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سال میں جو پانچ دن بچے وہ اِن یکسانیت پسندوں نے تعطیلات بنا دیئے۔ وزن و پیمائش کا طریقۂ میٹرک اِس سے پہلے "مجلسِ قومی" کے حکم سے مکمل ہو چکا تھا۔ زمین کے بادشاہ کو معطل کر کے انقلابیوں نے آسمان کے بادشاہ کو بھی عرش سے اُتار دینے کا حکم نافذ کیا۔ گرجاؤں کو بند کر کے قربان گاہوں کے خزانوں کو لُوٹا اور خانقاہوں کو قومی حکومت کی ملکیت بنا لیا۔ حضرت مریم اور حضرت عیسےٰ کی مورتوں کو توڑ پھوڑ کر مارا اور دیگر محبّانِ وطن کے بُت کھڑے کر دیئے۔ لوگوں کی دیوانگی کا انتہائے کمال عقل کی پرستش میں ظاہر ہوا جب انہوں نے ایک شہرہ آفاق شاہدِ بازاری کو نوتردام کی قربان گاہ پر لا بٹھایا اور اِس عقل کی دیبی کی پُوجا پیرس اور فرانس کے دُوسرے حِصّوں میں عام طور پر ہونے لگی۔

اِس وقت آشوبئے تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ روبس پیئر نے جو ایک جمہوری مطلق العنان بنا چاہتا تھا دوسرے دونوں گروہوں کے سرکردوں کو یکے بعد دیگرے پھانسی پر چڑھوا دیا۔ اب صرف وہی "کُوہِ مقدس" کی چوٹی پر تنہا کھڑا ہوا نظر آتا تھا لیکن اُس کی باری بھی عنقریب آنے والی تھی اپنی مکمل کامیابی کے بعد اُس کا پہلا کام فرانس کو لامذہبی کے پنجے سے چھڑا کر دوبارہ ایک خدا پرست قوم بنانا تھا۔ چنانچہ ۷، مئی ۱۷۹۴ء کو اُس نے مجلس کے سامنے خدائے ذوالجلال کی غیر فانی ہستی پر ایک زبردست تقریر کی۔ مجلس نے اِسکے

مطابق ایک قانون نافذ کیا اور بجائے عقل کی دیبی کے فرانس کی عبادت گاہوں میں پھر الہ العالمین کی پرستش ہونے لگی۔
لیکن اس کے ساتھ ساتھ "حفاظتِ عامہ کی بڑی کمیٹی" پیرس میں اپنی قتلِ عام کی عدالت لئے بیٹھی تھی۔ قید خانوں سے ہر روز صدہا بدنصیبوں کو گھسیٹ کر "عدالتِ انقلابی" کے سامنے لایا جاتا اور صرف گذشتہ امارت کے اقرار پر طرفۃ العین میں اُن سر قلم کردیا جاتا۔ صوبوں میں حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ شہر نانٹ میں چار مہینے کی قلیل مدت میں پانچ ہزار جانیں تلف ہوئیں۔
بالآخر روبس پیئر کی باری آئی۔ مجلس نے اُسے اور اُس کے تمام جانب داروں کو جمہوریہ کے دشمن قرار دیا اور وہ ایک ایک کرکے "مقدس گلوتین" کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادئے گئے۔
اِس دَورِ آشوب کا اثر فرانس میں تو وہی ہوا جو آشوبیوں کے پیشِ نظر تھا۔ لیکن غیر مُلکوں میں وہ لوگ جو اب تک تحریکِ انقلاب کے حامی تھے اس سے بیزار و برگشتہ ہوگئے۔

مجلس کی مخالفت اور بچاؤ پیرس میں مجلس کی زندگی معرضِ خطر میں تھی۔ نمائندوں پر یہ بات تجربے سے ظاہر ہوچکی تھی کہ "انقلابی حکومت" کا بڑا نقص حکومتِ آئینی اور حکومتِ عاملانہ کا اجتماع تھا۔ اِن دونوں اختیارات کا جُدا جُدا اشخاص کے ہاتھوں میں ہونا دولت کی سلامتی اور مناسب کارپردازی کے لئے ضروری تھا۔ مجلس نے اِس غرض سے ایک نیا دستور مرتب کیا کہ پانچ شخصوں کی ایک نظامت کو عاملانہ اختیار دئے جائیں اور قانون سازی کے لئے دو مجلسیں "مجلسِ پنج صدی" اور "مجلسِ قدما" منتخب کی جائیں۔ جن کے ایک تہائی نمائندے ہر سال نئے ہوں۔ یہ خیال کرکے کہ مجلسیں ایسے نازک وقت میں شاہ پسندوں کی بھرمار سے بچ جائیں مجلسِ مدعوہ نے قرار دیا کہ نئے انتخاب کا یہ قانون خود اسی مجلس پر عائد کیا جائے۔ پیرس کے وہ لوگ جو مجلس اور اُس کی کارروائیوں سے اُکتا گئے تھے فوراً برہم ہوگئے اور ۵۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو چالیس ہزار آدمیوں کا ایک بے ترتیب مجمع "دو تہائیوں پر لعنت" کے نعرے مارتا ہوا مجلس کی نشستگاہ تیولری کی طرف بڑھا۔ لیکن ابھی وہ قریب نہ آنے پائے تھے کہ "چھرّوں کی ایک بوچھاڑ" نے اُنہیں پیرس کے گلی کوچوں میں تتر بتر کردیا۔
اِس چھوٹے سے توپ خانے کا افسر ایک اجنبی نوجوان جزیرۂ کارسیکا کا ایک باشندہ تھا۔ آخر کار انقلابِ فرانس نے ایک مردِ میدان پیدا کردیا جس کی اعانت سے اُس کا نظام و استحکام انجام کو پہنچا۔ اور جس نے بالآخر اسی انقلاب کو اپنی عظمت کا زینہ بناکر شہرت کا وہ ڈنکا بجایا کہ اک دُنیا اُس کی زلزلہ خیز آواز سے گونج اٹھی۔

بشیر احمد

شخصیتیں اور خیالات

شخصیتیں ناکام ہوتی ہیں، خیالات زندہ رہتے ہیں!

ہم اکثر کہتے ہیں "یہ آدمی اچھا ہے" "وہ آدمی بُرا ہے"۔

شہرت کے انعامات کے لئے ایک شاندار جدوجہد برپا ہے!

شخصیتیں حیات و ممات کے معاملے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی مرجاتا ہے۔ پھر ہم جان لیتے ہیں کہ وہ تو فقط اک حادثہ تھا اور حقیقی شے وہ خیال تھا جس کے ساتھ اُس نے اپنے تئیں وابستہ کرلیا!

لنکن قتل کردیا گیا لیکن آزادی کی ترقی نہ رُکی!

بُدھ گذر گیا لیکن اُس کے خیالات ایک برگد کے درخت کی طرح پھیلے اور خلقِ خدا کو اپنے سائے میں لے لیا۔

سقراط کو زہر دے کر یا جون آف آرک کو جلا کر دُنیا کے ہاتھ کیا آیا؟ وہ تو محض بُلبلے تھے ندی جُوں کی تُوں بہتی رہی!

جنگِ عالمگیر میں سے اِک خیالِ عظیم پیدا ہُوا ایسا پُرعظمت کہ لاکھوں آدمیوں کے خُون کی قیمت اُس کے لئے گراں نہ تھی۔ وہ کیا ہے؟ دُنیا کی حکومت! آخرکار دُنیا والوں نے دیکھ لیا اگرچہ یہ دیکھنے کے لئے اُنہیں آتشِ جہنم میں سے گذرنا پڑا کہ انسانیت کو ایک ہونا لازم ہے!

جاپانی۔ انگریز۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ امریکن۔ یہ وقت کے افسانے ہیں اور فقط انسانیت ایک ازلی یقین ہے!

ایک ایسا پُرزور خیال اک ایسی حیات آفریں قوت، انسانی بہبودی کی یہ غیر انجام ممکنات اہلِ دُنیا کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔

(چیدہ)

اسے ممکن العمل ماننا خدا کو ماننا تھا۔ یہ اک کہنے کی بات تھی کرنے کا کام نہ تھا۔ ایک ایسے سُودمند خیال پر سارے چنگیز بھڑک اُٹھے اور حکم دے دیا کہ یہ بچہ قتل کردیا جائے۔

اے جاہلو! جو خیال ایک بار پیدا ہُوا وہ فنا نہیں ہوسکتا۔ سچ ایک بار بولا گیا تو وہ زندہ رہے گا حالانکہ توپیں جو اُس پر گولہ باری کرتی تھیں جلد زنگ خوردہ ہوچکیں گی!

شخصیتیں جنہوں نے زمین پر اتحاد پیدا کرنے کی پہلی کوشش کی رخصت ہورہی ہیں۔

لیکن وہ خیالِ عظیم انسانیت کی وحدت، بین قومی عدالت، مُلکِ دُنیا کی فوج، وہ نہ رُکنے والا خیال جتنا پسپا کیا جائے گا اُتنا ہی آگے کو بڑھے گا قتل ہوگا لیکن قتل ہونے پر ہر بار تازہ اور متبسّم اُمیدوں کو پہلو میں لئے ہُوئے اُٹھے گا!

تم اُسے فنا نہیں کرسکتے جب تک انسانی عقل کو ملیامیٹ نہ کردو! تمہارے تمام اِنکار اُس کی بڑھتی ہُوئی قوتوں کے نیچے دب کر پس جائیں گے۔

اُس کا آنا لازم ہے! جنگی بیڑے باربردار جہاز بن جائیں گے فوجیں منتشر ہوجائیں گی سپاہی کسان بن جائیں گے۔ لاکھوں کروروں آدمیوں کی محنت کا پھل حماقت کی آگ میں جھونکا نہ جائے گا بلکہ کام میں لایا جائے گا تاکہ دُنیا بھی اک بہشت ہوجائے!

سلطنت کا پُرانا اور زہریلا خیال مِٹ جائے گا!

وہ نیا خیال وہ نئی دُنیا کا خیال وہ عالمگیر اتحاد کا خیال زندہ رہے گا! اور آتشِ جہنم بھی اُس کے وجود کو ضرر نہ پہنچا سکے گی!!

گلچیں

تحقیق الالسنہ

یُورپ کے محققین السنہ مختلف اوقات میں امّ الالسنہ کے متعلق مختلف رائیوں کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں سریانی کو سب زبانوں کی اصل خیال کرتے تھے بعدہٗ ایک بڑا گروہ اِس بات کا مؤید ہُوا کہ سنسکرت ام الالسنہ ہے۔ پھر سمجھنے لگے کہ تورانی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور تورانی کا مسکن وسط ایشیا ہی تمام اقوام کا مخزن ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ تورانی ام الالسنہ ہے۔

بقول رڈ پاتھ امریکن اب یہ عقیدہ ہے کہ سب زبانیں آپس میں چھوٹی بڑی بہنیں ہیں اور موجودہ زبانوں میں سے ہر ایک قدیم ہے اور یہ سب کسی ایسی زبان کی شاخیں ہیں جو تاریخی زمانہ سے پہلے ہی معدوم ہو چکی تھی اور اب دُنیا کے کسی حصّہ میں نہیں بولی جاتی۔

کچھ عرصہ سے عُلمائے یُورپ عرب کے آثارِ قدیمہ کی تلاش میں مصروف ہیں۔ بہت سے کتبے دستیاب ہُوئے ہیں جن سے عرب کی قدامتِ بعیدہ کا ثبوت بہم پہنچا ہے نیز مزید کتبوں اور معلومات کے حصُول کی قوی اُمید ہے۔ اگر عربی آثار سب سے زیادہ قدیم دریافت ہُوئے تو اہلِ یُورپ ہمارے اِس دعوٰے کو ماننے کے لئے تیار ہو جائینگے کہ عرب اور اس کی زبان تمام اقوامِ دُنیا کی زبانوں کا ماخذ ہے ورنہ اب تک تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ اوّل تو عرب کی تاریخِ قدیم سب قوموں سے زیادہ تاریکی میں تھی جس کا سبب تمام متمدن اقوام کے آغازِ تہذیب سے پہلے فراموش ہو جانا تھا۔ دوسرے آثارِ قدیمۂ عرب تک بدویانِ عرب کی خونریز غارتگری و تعصب کے باعث اہلِ یُورپ کی رسائی نہ تھی تیسرے قوموں کا اتحاد ثابت کرنے میں سب سے بڑا اصل الاصول زبانوں کا الفاظی اِتحاد ہے۔ جس میں [illegible] ہُوئی۔ کیونکہ اِن کے اِبتدائی محققین نے عربی ادب کی محض سرسری واقفیت کے سبب سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ سامی و آرین و تورانین۔ زبانوں کے تین خاندان باہم کُلّیتاً غیر مماثل و اجنبی ہیں جن میں بجز چھ سات الفاظ کے جو اتفاقاً مشابہ نظر آتے ہیں کوئی مطابقت نہیں ہے، اور اِسی غلط فیصلہ پر تمام متوسطین و متاخرین یقینِ کامل کرتے چلے آ رہے ہیں۔

آثارِ قدیمہ سے اہلِ یُورپ عرب کی قدامت کا ثبوت حاصل کر لینگے مگر [illegible] الالسنہ ثابت

کرنے کے لئے اِن کو ہدایاتِ ذیل پر عمل کرنا چاہیئے اِن ہدایات پر عمل کرنا اہلِ تحقیق کے لئے اعجاز نما عینک ہو گا تمام دُشواریوں کے پہاڑ جو اِس وقت حائل ہیں کافور بن کر اُڑ جائینگے اور تمام دُنیا میں بجز عربی کے اور کوئی زبان نظر نہ آئیگی۔

۱۔ اِس خیال کو ترک کر دینا چاہیئے کہ مشہور متمدن ممالک کے مقابلہ میں عرب جدید التہذیب ہیں یا اُن متمدن ممالک کی زبانیں انکی خود ساختہ ایجادیں ہیں اور اِن کے اہلِ زبان عُلماء لغت کی تشریح و تجزیہ بالکل صحیح ہے۔

۲۔ ہر لفظ کے لئے خواہ وہ کسی مُلک کی زبان کا ہو سہ حرفی عربی مادّہ تلاش کریں بڑا لفظ ہو تو تجزیہ کر لیں

۳۔ اگر لفظِ تحقیق طلب میں ایسے حرف ہوں جو عربی میں نہیں آتے تو قواعدِ فلولوجی کے تحت میں اُن حروف کو عربی حرفوں سے بدل لیں۔

۴۔ اگر لفظِ مذکور بلحاظِ صُورت و معنی عربی میں مل جائے تو فبہا۔ ورنہ غور کریں کہ وہ عربی کے کس مادّہ کے تحت میں آ سکتا ہے جب ایک مادّہ تجویز کر لیا تو دیکھیں کہ اِسی مادّہ کے مشتقات میں لفظِ مطلوبہ کے غیر زبان والے معنی کہیں شامل ہیں یا نہیں۔ اگر شامل ہیں تو دیکھنا چاہیئے کہ اُس مادّہ سے کسی عربی قاعدۂ صرف کے تحت میں لفظِ غیر کا ہمشکل بن سکتا ہے یا نہیں، اگر بن سکتا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ اِسی مادہ سے ہے مگر دوسرے قاعدۂ عربی سے بنا لیا ہے۔ اگر شامل نہیں تو تحتِ فلولوجی دوسرا ہمشکل مادّہ تلاش کریں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

۵۔ مطابقت کے وقت قلیل الاستعمال قواعدِ صرف پر بھی نظر رکھیں جن میں سے بعض اگرچہ متداولہ کُتُبِ صرف عربی میں مذکور نہیں مگر ان کے تحت میں بنے ہُوئے بہُت سے الفاظ کُتُبِ لُغات میں لکھے ہُوئے مِلتے ہیں۔

۶۔ الفاظ کے معانی کی مطابقت کے وقت انکے خصوصی لوازم کو مقدم قرار دیں صرف عمومی قرینہ پر اکتفا کرنا جیسا کہ عُلماءِ یُورپ کا طریقہ ہے محض غلطی ہے۔

عمومی قرینہ کو کافی سمجھنے کی ایک مثال مولوی شبلی نے الفاروق میں نقل کی ہے اور وہ یہ کہ دیوان۔ دفتر۔ دبستان۔ دبیر۔ چاروں لفظ فارسی مادّہ دب سے جس کے معنی نگاہ داشتن ہیں بنے ہیں۔ مگر اِن چار لفظوں کے پہلے دو دو حرف تو قائم مقام دب کے ہیں جو مُبدلی یا اصلی حالت میں ہیں اور ستان یعنی

جگہ فارسی کا متعارف لفظ ہُوا۔ باقی وان۔ تر۔ تیر کے کیا معنے؟ یہ نہیں بتایا۔ کہہ سکتے ہیں کہ بان علامت فاعلی فارسی ہے جیسی مہربان میں اس کا مبدل وان ہے مگر تر۔ یر پھر بھی مجہول المعنی رہے۔ مجبوراً تر کے مشہور معنی بسیار لینگے عربی میں دیوان کے معنی ہیں فراہم آمد نگاہ کُتُب وکتاب کہ در آں لشکریان واہلِ عطیہ مکتوب باشند یہ معنی اہل عرب کے بیان کئے ہُوئے ہیں اور انہوں نے یہ نام اور اس کے معنے اہلِ فارس سے لیئے تھے اس واسطے یہ لفظ مع اپنے مفہوم کے فارسی سمجھا گیا ہے۔ ہندوستان کی فارسی میں دیوان کے معنی مختار کل یا وزیرِ اعظم یا نائب حاکم کے ہیں چنانچہ عالمگیر نے داراشکوہ کے مختار پہاڑامل کو رقعاتِ عالمگیری میں دیوانِ سرکارِ برادرِ نامہربان کہا ہے اور اب تک یہ نام اسی معنی میں مشہور ہے چنانچہ خانقاہِ اجمیر شریف کے سجادہ نشین دیوان جی کہلاتے ہیں یعنی خواجہ صاحب کے دیوان اور چیتوڑ کے رانا سری دیوان جی سے مخاطب ہوتے ہیں یعنی انکے دیوتا ایکلنگ جی کے (جو پاس کے پہاڑی مندر میں ہیں) دیوان۔

دیوان کے ایک معنی قاضی یا منصف یا جج کے بھی ہیں چنانچہ عدالتِ دیوانی کے لفظ میں دیوان کے یہی معنی ہیں۔ پانچویں معنی مجموعہ اشعار کو کہتے ہیں چنانچہ شاعروں کے کلام کے مجموعہ کو دیوان کہتے ہیں اب ہم ان سب کی شرح لکھتے ہیں۔

(۱)۔ کتب خانہ عربی دِبِیج وَعَنْ کا مخفف و مبدل ہے کیونکہ دِبِیج ازدوج بمعنی کتابِ نگاشتہ وَعَن بمعنی جائے حفاظت۔

(۲)۔ رجسٹر فوج واہلِ عطیہ۔ دیوان ازدَین مثل جَزَ واض وجزواط حساب خدمت و پاداش (انعام و تنخواہ) خادمان وبندگان بدیانت دارندہ۔

(۳)۔ نائبِ حاکم یا وزیر یا مختارِ آن دیوان مبدل دِوْوان ازدون۔ مردے کہ درتحت کسے کار کند

(۴)۔ منصف یا قاضی دیوان ازدَین آیۂ مالکِ یومِ الدّین میں دین کے معنی عدل وانصاف ہیں۔

(۵)۔ مجموعہ اشعار اصلاً ضَحْوَ وَعَنَ ہے ضَحْوَ کلامِ روشن وواضح وَعَنَ بمعنی مجموعہ۔

دفتر کو لغت نویسانِ عرب نے معرب نہیں بتایا۔ بلکہ خالص عربی قرار دیا ہے۔ مگر مخبوطانِ عجم پرستی نے جس طرح اور صدہا عربی الفاظ کو فارسی الاصل ٹھیرادیا اسی طرح اسکو بھی فارسی کہدیا ورنہ یہ اصلاً تفتر مادّہ نتر سے ہے۔ اظہارِ مبالغہ کے لئے عین کلمہ کو اول میں اضافہ کرکے عَفْعَل کے وزن بنالیا ہے جیسے رَفْف سے قَرْقَفْ۔ فَتْر کے معنی برگ ہائے درخت۔ بنشتنی یا بنشتہ فراہم کردہ اسی واسطے لغاتِ عرب میں تفتر کا

ترجمہ دفتر کیا ہے اور مادّہ فتر میں درج ہے۔ تَ دَ متبادل ہیں رواج کاغذ سے پہلے درختوں کے پتّوں پر لکھا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھوج پتّر لکھنے کے کام آتا تھا اِسی فَتر سے ہِندی پَتّر بمعنی برگِ درخت بنا ہے ہندی میں چِٹّھی کو پتّری اور برہمنوں کے مستعملہ خلاصۂ جوتش کو پتّر اِسی واسطے کہتے ہیں کہ پہلے پتّوں پر لکھے جاتے تھے۔ کاغذ کو پتّر اِس واسطے کہتے ہیں کہ وہ پتّوں کی جگہ کام آیا ہے۔

دبستان میں دَب عربی دَبّ بمعنی طریقۂ مذہب وعدل ونرمی اختیار کردن یا آموختن ہیں تعلیم کے بہترین مقاصد یہی ہو سکتے ہیں۔ سِتان فارسی کو ستھان ہندی کا متبدل بتاتے ہیں۔ مگر ستھان عربی سِطحان بوزن اِنسان بمعنی جائے ہموار یا مکان مُسَقّف ہے دبّ سِطحان کے معنی تعلیمگاہِ مذہب و اخلاق وسیاست ہُوئے جس کا بگاڑ دبستاں ہے۔

دبیر اصلاً خبیر از خبر بلفظ دال بمعنی کاتب ودفتری ومثلنخوان۔ خَ کا دَ بنالیا اہلِ نظر دیکھ سکتے ہیں کہ عربی ہر لفظ کی اصلی وحقیقی شرح بتلاتی ہے اور فارسی شرح صرف ایک اوپری بے محل قرینہ ہے جو مقصود سے تقریباً بعید ہے۔ کیونکہ صرف نگہبان سب کے معنی میں کہدینے سے تمام الفاظ کی جُدا گانہ لازمی خصوصیات شارح فارسی کے پیٹ میں رہ جانے کے سبب سے سامع کو معلوم نہ ہو سکیں اور صرف نگہبان کا لفظ عام سمجھ میں آیا جس میں گنجائش ہے کہ دیوار بمعنی نگہبان خانہ۔ دوات بمعنی نگہبانِ سیاہی۔ دوش بمعنی نگہبانِ دست دُور بمعنی نگہبان درازئی فاصلہ دیر بمعنی نگہبان درازئی وقت دَیر بمعنی نگہبانِ اصنام وغیرہ اپنے دل میں قرار دیکر سب کو دب کے مادہ سے سمجھ لیں۔ پس فارسی شرح ایک بیخبرانہ تحقیق ہے بھروسہ کے لائق نہیں۔ خود دب فارسی عربی دبّ سے بنا ہے جس کے معنے نکتہ چینی وسیاست ہیں جو نگہبانی کے مرادف ہیں۔ یہ بات کہ عجمی لغت نویسوں کی تشریحات ناقابل اعتبار ہیں مندرجہ بالا تشریحات سے ثابت ہو گئی ہے نیز یہ کہ ان کی املا بھی غلط ہو جاتی ہے جیسے خبیر کا دبیر بنگیا اور یہی انکے عربی سے غیر ہونے کا سبب ہے۔

۷۔ اہلِ تحقیق کو خود عربی ڈکشنریاں بھی بعض دفعہ دھوکا دیتی ہیں کیونکہ انکے لکھنے والے فلولوجی سے واقف نہ تھے نہ انہوں نے الفاظ کے خصوصی لوازم سے سروکار رکھا۔ جن الفاظ کا تلفظ فنِ کتابت سے پہلے ہی بدل گیا تھا انکو لغت نویسوں نے اپنے زمانہ کی مشہور قرءت کے موافق ان مادّوں میں درج کر دیا جن کے تحت میں وہ موجودہ قرءت کی بنا پر آ سکتے تھے حالانکہ بلحاظ خصوصیاتِ معنی وہ اس مادہ سے متعلق نہ تھے۔ اس لئے اِن کا مفہوم اپنے مندرجہ لغت مادّہ سے غیر بن گیا اور اسی مغائرت کی وجہ سے بعض علماء نے انکو معرّب

قرار دیا جیسے لینہ بمعنی کھجور کا درخت لین کے مادہ میں درج کر دیا حالانکہ لون سے متعلق تھا نیل کو جو دریائے مصر کا نام ہے ن ی ل میں درج کر دیا حالانکہ نول سے متعلق تھا یا بعیر اونٹ کا نام اصلاً بحیر تھا مگر اسکا تلفظ فن کتابت سے پہلے بدل گیا تھا اسلئے بعیر کو اہل لغت نے بعر کے مادہ میں لکھدیا پس اہلِ تحقیق کو چاہیئے کہ ہمیشہ عربی لغات میں لکھے ہوئے مادہ پر منحصر نہ رہیں بلکہ اسکے ہمشکل مادوں میں لفظِ تحقیق طلب کے خصوصی لوازم کو تلاش کریں مثلاً خبیر بمعنی نویسندہ و کاتب وغیرہ کی بابت شبہ ہو تو اسکا ہمشکل زبیر موجود ہے کیونکہ اسکے مادہ زبر میں معنی نوشتن و خط و کتابت کردن ہیں جس کی آواز د و ز دونوں کے مطابق ہے۔

تجزیہ کی مثال یہ کہ مثلاً ٹکسال ہندی لفظ بمعنی سکہ بنانیکا گھر ہے اور پنج حرفی ہے یہ معلوم ہے کہ سال ہندی میں گھر کو کہتے ہیں اسلئے اسکے دو ٹکڑے۔ ٹک۔ سال۔ کر لئے۔ اب ٹک کو عربی صورت میں بامعنی تلاش کئے تو تکّ۔ طکّ۔ تق۔ طق سے کچھ پتہ نہ لگا تقعَ ثلاثی اور کچھ بامعنی معلوم ہوا مگر مطابقت معنی اس میں بھی کچھ نہیں ملی خیال ہوا کہ مادہ وقع سے تقعَ بن سکتا ہے جسطرح وقی سے تقیا بنا جو اصل ہے تقویٰ کی اسی طرح وقع سے تقعا بنگیا جو ہم معنی وقع ہے۔ تقعا کا مخفف تقع اور ہندی میں تک ہو گیا وقع کے معانی کا استنباط ہے۔ دھات کے ٹکڑے کاٹ کر انکو سنگ فسان پر جلا دینا اور حروف نشان منقش کرنا یہی صورت قدیم سکہ سازی کی ہے۔

سال عربی میں ثال فاعل ثلّ ہے اسکے معنی ہیں مویشی اور آدمیوں کے آرام کرنیکے لئے آراستہ و رخنہ دار گھر ہندی میں عام گھر کیواسطے مستعمل ہے غرض ٹکسال کے معنی سکہ بنانیکا گھر ہوا یہی مطلوب تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ ٹکسال کے معنے ٹکے بنانیکا گھر ہوگا۔ مگر ٹکہ دو پیسے کو کہتے ہیں اور ٹکسال میں پیسہ روپیہ اشرفی سبھی بنتے ہیں اس لئے یہ شرح درست نہیں۔

اصلاً ٹکہ مخفف و مبدل تہ قہ کا ہے تہ کے معنی دو قعہ دوسری صورت وقع کی ہے جیسے ضَعَۃ دوسری صورت وضع کی ہے۔ تہ قعہ کے معنی دو پیسہ یا ٹکہ۔ اہل یورپ تلاش کرتے ہیں کہ ٹکسال یا ٹکہ اپنی اصلی صورت میں لکھا ہوا مل جائے سوا ایسا حلوائے بے دود کہاں رکھا ہے۔ یہ تو تب ہو سکتا تھا جب ہندی سے عربی میں یہ الفاظ منتقل ہوتے جیسے تکرّ ٹھاکر کا معرب ہے اور اہلِ عرب نے راجپوت رئیسانِ سندھ سے سنا تھا مگر راجپوتانہ میں ٹھاکر کہتے ہیں ہندی میں اسکی شرح ٹھاہ گرو کرتے ہیں۔ ٹھاہ بمعنی جگہ گرو بمعنی آقا یعنی آقائے مقامی عربی میں ٹھاہ کے مقابل تاہ بمعنی زمین یا قلعہ بلند ہے کرّ بمعنی فوجدار و سیاست کنندہ تمام ٹھاکر گڑھیاں رکھتے ہیں۔

گرو مذہبی اُستاد کو کہتے ہیں۔ راجپوتانہ میں گرو کہتے ہیں یہ عربی لفظ کرّو بوزن فعُول از کرو بمعنی قائم اللیل در عبادتِ خدا و وعظ و ذکر بندگی بسیار گوئیندہ و باُجرتِ کار کنندہ گرو اپنے چیلوں سے خدمت اور تنخواہ بھی لیتے ہیں۔

باقی آئندہ

قیصری

کلام خسرو پر اعتراضات
کا
تحقیقی جواب

امیر خسرو ؒ بہ بازی سوئے من آمد بہ شوخی دل ز من بستد

بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار مے آید

عام محاورہ بکار آمد ہے کار آمد امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔

شعر العجم مولٰنا شبلی حصّہ دوم بیان امیر خسرو صفحہ ۱۸۰

امیر خسرو ؒ سالہا شد کہ نیایم خبرو در کویت	دل ویران شدہ را آیم و آواز کنم
من از سر زندہ گردم گر تو یارا یک سخن گوئی	تو مے دانم نگوئی لیک من گفتار میگویم (مجھ کو معلوم ہے اگر تم نہ کہوگے لیکن میں بات کہتا ہوں)
دعوائے خوں بہائے دِل خویش مے کنم	یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کُن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُن کے سوا کسی اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں مِلتے مثلاً از گرۂ او چہ[1] میرود

آواز کردن	پُکارنا
گفتار میگویم	یُوں ہی ایک بات کہتا ہوں
مالا کلام کردن	کِسی کو ساکت اور بند کرنا

اِس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن چونکہ ہمکو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے

شعر العجم حصّہ دوم صفحہ ۱۸۱ و ۱۸۲

---

[1] امیر خسرو ؒ جان میرود ز تن چو گرہ میزنی بہ کلام — مردن مراست از گرۂ او چہ مے رود

شعر العجم حصۂ دوم صفحہ ۱۸۲

اس کو مولنا شبلی مرحوم کی ہضم نفسی کیئے یا ارادتمندی کہ وہ اِس بدگمانی میں بدگمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہیں بخلاف اُن مُصنّفین کے جنھوں نے اپنی استقراء اور تتبع پر بھروسہ کرکے اِسی قسم کے شبہات کو سنگین اعتراضات کے لباس میں ظاہر کیا ہے عبدالباسط مُصنّف شرع الشعراء نے بابِ پانزدہم در پیروی طریقت شعرا میں لکھا ہے کہ

اُستواری مہارت این فن را لازم ست کہ اعتماد بر محاورہ شعرائے ہندوستان نکند ہر چند از کامل ترینان باشد چنانچہ بعض محاورۂ اشعار امیر خسرو دہلوی کہ خسرو شاعران بود دست نیز خالی از شبہ نباید شمرد مطابق ہندوی وقتے بطریق ظرافت بستہ باشد — چنانکہ دریں بیت امیر مذکور ؎

ادمے رود بناز و گرہ مے زند بزلف
مردن مراست از گرۂ او چہ مے رود

از گرۂ او چہ مے رود اغلب کہ محاورہ از گرہ او چہ مے رود مطابق ہندوی بستہ باشد جائے دیگر بنظر نیامدہ۔

غالباً مولنا شبلی مرحوم کا ماخذ اِن شبہات کے متعلق ہندوستانی محققین کی تصانیف ہی ہوگا کسی ایرانی مُصنّف کا کوئی اعتراض اس قسم کا ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

ہمارا حسنِ عقیدت جو ہمکو حضرت امیرِ خسرو کے کلام وکمال سے ہے ان شبہات کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ امیر خسرو اگرچہ ہندوستان میں بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ پیدا ہوئے لیکن اُنکی گھر کی زبان فارسی ہی تھی اُن کی ماں عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اُن کی گھر کی زبان بھی فارسی تھی۔

اگر والہ داغستانی کی روایت پر اعتبار کیا جائے تو امیر خسرو باپ کے ساتھ ہندوستان میں آئے ہیں اِس صورت میں وہ ہندی نژاد بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ روایت اور تمام تذکرہ نویسوں کے خلاف قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

دس سال کا بچّہ مادری زبان سیکھ جاتا ہے اگر کوئی خاص وجہ غیر اہلِ زبان لوگوں میں آمیزش کی نہ ہو تو اُس کی زبان بیرونی اثرات سے محفوظ رہتی

امیر خسرو امیر زادہ تھے اُن کے والد سیف ... و ترکستان کے رئیس تھے اور ہندوستان

میں آکر سلطان محمد تغلق کے دربار میں ممتاز عہدہ پر مامور ہوئے پس کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ امیر خسرو کی زبان پر اس قدر جلد ہندوستان کی ماندوبود کا اثر پڑا ہو۔

اِن وجوہ سے حضرت امیر خسرو کی مادری زبان فارسی اور اکتسابی زبانِ ہندی مروج الوقت قرار پاتی ہے ہمیشہ اکتسابی زبان میں نظم کی پابندی اور خیالات کی ترجمانی سے لغزش ہوسکتی ہے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ ہمیشہ جو خیال اِنسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ اُس کی مادری زبان میں پیدا ہوتا ہے پھر خواہ اُس کو کسی زبان میں ترجمہ کرکے ظاہر کیا جائے۔

امیر خسرو کی مادری زبان فارسی ہے اُن سے یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال اُن کے دماغ میں پیدا ہو وہ اُس کو فارسی نما ہندی میں ظاہر کریں درانحالیکہ وہ فارسی ہی میں ادا کرنا چاہتے ہوں۔

امیر ابوسعید مسعود سعد سلمان لاہوری بھی حضرت امیر خسرو کی طرح ہندی نژاد ہیں اور امیر خسرو کی طرح ہندی زبان کے بھی شاعر ہیں لیکن اُنکی فارسی زبان میں ہندی محاورات کی آمیزش بیان نہیں کیجاتی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو ہندی نژاد ہو اُس کی مادری زبان فارسی نہ ہو اور اُس کی زبان میں ہندی محاورے اور ہندوستان کی سکونت کا اثر پایا جائے۔

بعض محققین ہند کو اُن کی غایت احتیاط وحزم نے متشکک ومتوہم بنا دیا ہے وہ جب تک ایک محاورہ کو چند فارسی شعرا کے کلام میں نہ دیکھ لیں اطمینان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خانِ آرزو نے اسی قسم کے اعتراضات تنبیہ الغافلین میں شیخ علی حزین پر وارد کئے ہیں کہ یہ محاورہ شیخ کے سوا اور کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا جن میں سے اکثر کے جواب مولوی امام بخش صہبائی نے قول فیصل میں دئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوئی معقول وجہ اعتراضات کی نہیں ہوسکتی اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ جو محاورہ کسی اہل زبان نے لکھ دیا ہے جبتک ہم اُس کو چند دیگر شعراء فارسی کے کلام میں نہ دیکھ لیں اس پر اعتبار نہ کریں۔

یہ ناممکن ہے کہ کسی زبان کے کل محاورے قید نظم میں آگئے ہوں اور کوئی محاورہ نظم ہونے سے باقی نہ رہا ہو۔ اہل ایران سے ہزاروں ایسے محاورہ سُننے میں آتے ہیں جو اب تک کسی نے نظم نہیں کئے ہیں زبان شعر بہت مختصر سی زبان ہے۔ اکثر پیشہ وروں کے محاورے۔ مستورات کا روزمرہ۔ اور تقریبات کی رسمیں وغیرہ نظم میں نہیں ملتے۔ اگر بُسحٰق اطعمہ کا کلام اور میر نجات اصفہانی کی گُل کُشتی ہمارے پاس نہ ہو تو ہم نہ کھانوں کے نام نہ کشتی کے داؤ پیچ سعدی وحافظ کے کلام سے معلوم کر سکتے ہیں اور نہ انوری وخاقانی کے قصائد اس بارہ

نیں کچھ ہماری مدد کرتے ہیں۔

اسی طرح اور دوسرے پیشہ وروں کی زبان پر قیاس کرلینا چاہیئے۔

اس بنا پر میری خوش اعتقادی اُن تمام شبہات کو صحیح نہیں سمجھتی جو امیر خسرو کے کلام پر متشککین نے کئے ہیں +

---

(۱)۔ امیر خسرو ؒ ~~ بہ بازی سوئے من آمد بشوخی دل زمن بستد ~~ بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار مے آید

کہا گیا ہے کہ عام محاورہ بکار آمد ہے امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گزرا۔ نظر سے نہ گزرنا تو کوئی معقول دلیل تغلیط نہیں ہے۔ دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس کی نظر سے اُن تمام شعرا کا کلام گزرا ہو جو آغازِ شاعری سے آج تک ہر مُلک و ہر دیار میں ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی نظیر تو ظہیر فاریابی کے کلام سے ہم پیش کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ~

جائے چاکے در گریبانم نماند

اے ظہیر امروز کار آمد نہ ذیل

اس کے علاوہ اہلِ ایران کا قاعدہ ہے کہ وہ حرف ظرف کو (خواہ یائے موحدہ ہو یا در ہو) اکثر روزمرہ میں حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے ماہے می آید ایک مہینہ میں آتا ہے۔ سالے میرود ایک سال میں جاتا ہے شب میرسد رات کو آتا ہے شعر میں بھی اکثر ایسا دیکھا گیا ہے سعدی ~

شب تاریک دوستانِ خدا

مے بتابد چو روز رخشندہ

یعنی دوستانِ خدا در شب تاریک چو روز رخشندہ می تابند۔ ظہیر فاریابی ~

گزشت عمر و نیامد شبے بسا لینم

بکارِ من چو نیاید چہ کار مے آید

مصرع ثانی بکار آمد و کار آمد دونوں کی سند ہے یعنے بچہ کار آمد کی جگہ چہ کار آمد حرف ظرف کو محذوف کر کے کہا ہے عام محاورہ بچہ کار آمد ہے امیر خسرو کا شعر ہے ~

نیم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم ~~ پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

سالہا شد کہ نیامد خبرو در کویت

(۲) دلِ ویران شدہ را آیم و آواز کنم

آواز کردن خلاف محاورہ بتایا جاتا ہے میں اس کو بھی تسلیم کرنے کے لئے طیار نہیں ہوں۔

ظہیر فاریابی کا شعر میرا موید ہے ؎

ناخن بدل زدن بطرب ساز مے کنم

آں زہرہ چہرہ را بخود آواز مے کنم

اگرچہ ظہیر کی سند کے بعد کسی دوسری نظیر کی ضرورت نہیں مگر ابوالفضل کا ایک شعر ناخواستہ زبان پر آگیا ہے از دفتر سوم ابوالفضل ؎

مطرب ترانۂ شبِ غم ساز می کنم

غمہائے رفتہ را بخود آواز می کنم

ابوالفضل معمولی شخص نہیں ہے اور جبکہ اُس کی تائید میں ظہیر فاریابی سا مسلم الثبوت اہلِ زبان ہے تو ابوالفضل کے کلام کا وہی پایۂ ثبوت ہو سکتا ہے جو ایک ایرانی اہلِ زبان کا ہونا چاہیئے

(۳)۔ امیر خسرو

من از سر زندہ گردم گر تو یا را یک سخن گوئی

تو می دانم نگوئی لیک من گفتار می گویم

گفتار گفتن محل نظر ہے۔ یہ شبہ دو وجہ سے ناشی ہوتا ہے ایک یہ کہ عام محاورہ سخن گفتن ہے۔ اور امیر خسرو نے گفتار گفتن کہا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسکا ترجمہ فصیح اردو میں مولنا شبلی نے (یوں ہی ایک بات کہتا ہوں) کیا ہے امرِ اوّل کی بابت یہ گزارش ہے کہ جو کچھ منہ سے کہا جائیگا اُس کے لئے گفتن ہی کا کوئی صیغہ استعمال ہو گا جیسے سخن گفتن شعر گفتن دعا گفتن سلام گفتن ترانہ گفتن تہنیت گفتن

گفتار گفتن کا حاصل بالمصدر سہی لیکن ہے تو سخن کا مرادف ہم جہاں لفظِ سخن بول سکتے ہیں وہاں گفتار بھی کہہ سکتے ہیں سخنِ شیریں گفتارِ شیریں۔ سخن تلخ گفتار تلخ پھر اگر سخن گفتن کی جگہ گفتار گفتن کہا گیا تو اس میں مخالفتِ محاورہ کیا ہے۔ محض قافیہ کی ضرورت سے بجائے سخن اُس کا مرادف گفتار کہا گیا ہے، جیسے کوئی پا زدن کی جگہ قدم زدن یا ساغر زدن کی جگہ ساتگیں زدن کہے تو ہرگز قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ پا اور قدم ساتگیں اور ساغر مرادف ہیں۔ اسے کلیہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی لفظ کا مرادف لانے سے

محاورہ میں اختلاف نہیں ہوتا۔ الاماشاء اللہ ایسے مواقع پر مطالبہ سند لازم نہیں یہ عام طور پر شائع ہے۔

دوسرے اس کا ترجمہ روزمرہ اُردو کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ اہلِ فارس کا محل استعمال پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اہلِ فارس کا محل استعمال صرف یہی ہے کہ میں بات کتا ہوں۔ اِس موقع پر بات کی جگہ سخن بھی کہینگے اگر اُس کا مرادف گفتار بضرورت قافیہ کہا گیا تو اس میں میرے نزدیک کچھ قباحت نہیں ہے

(۴۲)۔ امیر خسرو

جانؔ میرود زتن چو گرہ مے زند بزلف

مردن مراست ازگرۂ اوچہ مے رود[1]

ازگرہ گرفتن پر اعتراض ہے۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو چیز جس ظرف میں ہوگی جب وہ اُس سے نکل جائیگی یا جاتی رہیگی تو اُسی ظرف کی طرف منسوب کرکے کہینگے مثلاً زر از دست رفت۔ دامن از کف رفت موزہ از پا رفت آب از مشک رفت۔ جان از جسم رفت اور جب کوئی چیز کسی ظرف میں موجود ہوگی تو اُسی ظرف کی طرف منسوب کرکے کہینگے۔ مثلاً دامن در دست ہست زر در کف ہست موزہ در پا ہست آب در مشک ہست۔ یہ محل استعمال عام ہے جو چیز جس ظرف میں ہوگی اُسی کے ساتھ نسبت کیجائیگی۔ اب سُنئے گرہ بھی ایک ظرف ہے جب کوئی چیز گرہ میں ہوگی تو کہیں گے در گرہ ہست۔ چنانچہ مرزا صائب نے گرہ کو ظرف قرار دیکر کہا ہے ؎

نیست چوں نافہ حاجتِ اظہار

در گرہ مُشکِ ناب اگر داری

اگر مُشک گرہ سے نکلجائے تو اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مُشک ازگرہ رفتہ اب امیر خسرو کا شعر پڑھیئے ؎

او میرود بناز و گرہ مے زند بزلف

مردن مراست ازگرۂ اوچہ مے رود

مقصود یہ ہے کہ میری جان اُس کی زلف میں ہے وہ زلف میں گرہ دینا جاتا ہے یعنی اُسے مروڑتا جاتا ہے اس صدمہ سے مری جان جو زلف میں پھنسی ہوئی ہے نکل جائیگی اور میں مر جاؤں گا

---

[1] مولٰنا شبلی مرحوم نے کسی غلط نسخہ سے یہ شعر نقل کیا ہے صحیح نسخہ یہ ہے ؎ او میرود بناز و گرہ میزند بزلف شرح الشعرا میں اور ہمارے پاس جو قلمی نسخہ ہے اُس میں اسی طرح ہے۔

زلف کی گرہ سے کچھ نہیں جائیگا۔

او کی ضمیر زلف کی طرف راجع ہے نہ کہ زلف والے کی طرف عجب نہیں کہ او کی ضمیر صاحب زلف کی طرف راجع کرنے سے یہ شبہ پیدا ہوا ہو۔

یہ نکتہ فراموش کرنے کے قابل نہیں ہے کہ جیسے امیر خسرو نے گرۂ زلف سے مضمون پیدا کیا ہے اسی طرح مرزا صائب نے گرۂ نافہ سے مضمون نکالا ہے دونوں شعروں میں بنائے مضمون گرہ ہے اس لئے دونوں شعر ایک حد تک متحد اور ایک ہی محاورہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ محض اتفاقیہ امر ہے کہ اُردو کا محاورہ (گرہ سے جانا) اس اسلوب بیان کے مطابق ہے اسی وجہ سے اس شبہ کو زیادہ تقویت ہوئی۔ شرح الشعرا کا یہ فقرہ کہ مطابق محاورہ ہندی نبتہ باشد کہ جائے دیگر بنظر نیامدہ" پڑھ کر مرزا صائب کا مرقومہ بالا شعر پڑھیئے اور اُس کی تحقیق و زباندانی کی داد دیجئے۔

اکثر محاورے فارسی اور اُردو کے مطابق ہیں مثلاً فارسی میں تراچہ افتادہ اور اُردو میں تجھکو کیا پڑی دونوں ایک ہی ہیں خواجہ حافظ ؎

بروبکار خود اے واعظ ایں چہ فریادست
مرا فتاد دل از کف تراچہ افتادست

ذوق دہلوی ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

(۵) امیر خسرو ؎

دعوئے خون بہائے دلِ خویش می کنم
یک بوسہ برلبم زن و مالاکلام کن

مالاکلام کردن بمعنے ساکت کردن پر اعتراض ہے۔

ہم نے اس شعر کو نسخۂ مطبوعہ و قلمی دونوں میں اسی طرح لکھا دیکھا ہے۔ اگر اس میں کاتب کی غلطی و تصرف نہیں ہے تو ضرور ایک عدالتی اصطلاح ہے مالاکلام بیع قطعی کو کہتے تھے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ابتک جے پور کی عدالتوں میں (جو اسلامی عہدِ سلطنت کے کہنہ نقش و نگار ہیں) یہ اصطلاح مروج ہے۔ یہاں اکثر دبیشتر اصطلاحیں دفاتر شاہی سے منتقل ہو کر آئی ہیں غالباً ایران کی عدالتوں میں یہ اصطلاح مروج ہوگی یا خاندانِ تغلق کے زمانہ حکومت کی یہ اصطلاح ہوگی۔ اس خیال

کا مؤید دعوئے خوں بہا شعر میں موجود ہے۔ اسکو ہندی محاورہ کا ترجمۂ فارسی بھی نہیں کہہ سکتے اُردو میں ایسا کوئی محاورہ بھی موجود نہیں ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ ہندی محاورہ کو فارسی میں ادا کر گئے ہیں نہ اس خیال کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ ہندی فارسی کے خلاف ایک جدید محاورہ ایجاد کیا گیا ہے۔ قدما کے کلام میں ایسے بہت محاورے ملتے ہیں جو اس زمانہ کی زبان میں نامانوس اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان ہر زمانہ میں رنگ بدلتی رہتی ہے چونکہ ہمکو ۷ سو سال پیشتر کی زبان سے کلیتہً واقفیت نہیں ہے ہماری واقفیت صرف اُسی حصّہ زبان تک محدود ہے جو بذریعہ کتب ہم تک پہنچی ہے اس لئے ہر ایسا لفظ ہر ایسا محاورہ جو ہم نے مروجہ کتب میں نہیں دیکھا۔ ہمکو نامانوس وغیر فصیح وغیر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ شاہنامہ پڑھیئے کوئی صفحہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس میں چند لفظ نامانوس نہ ہوں اور اُن کی سند بھی بجز شاہنامہ کے اور کہیں نہیں ملے گی اگر مالا کلام کردن کوئی اصطلاح نہیں ہے تو ضرور اس شعر میں کتابت نے تحریف کی ہے اور یکے بعد دیگرے نقل در نقل ہوتے ہُوئے یہ غلطی عام ہو گئی ہے میرا خیال ہے کہ مصرع ثانی اصل میں یوں ہو گا ؎

یک بوسہ بر لبم بزن و لا کلام کن

کاتب نے بزن کی جگہ زن اور لا کلام کی جگہ مالا کلام لکھ کر شعر مسخ کر دیا ہے۔

اس صورت میں کوئی شُبہ باقی نہیں رہتا۔ جیسے لاجرم لابد لاریب اسی طرح لا کلام۔ امیر خسرو نے یہاں بھی لا کلام کو بے سخن کا مرادف استعمال کیا ہے جو شخص بے سخن ہو گا وہ ضرور خاموش ہو گا۔ مصرعہ

یک بوسہ بر لبم بزن و لا کلام کن

ایک بوسہ دیکر مجھے خاموش کر دے۔ واللہ اعلم

علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم کے صفحہ ۱۰۹ میں امیر خسرو کی یہ رباعی نقل کی ہے

ہر موئے کہ در دو زلفِ آں صنم است	صد بیضۂ عنبرین بر آں موئے ضم است
چوں تیر بداں راس دلش را زیرا کہ	چوں خربوزہ دندانش درونِ شکم است

مولٰنا نے مصرع اول پر نوٹ دیکر لکھا ہے کہ جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔ ہمارے خیال میں رباعی کے مصرعہ اول پر اور کوئی وجہ نوٹ دینے کی نہیں ہو سکتی بجز اسکے کہ اس مصرع کا وزن ناماموس ضرور ہے اسی سے مولٰنا کو اس پر ناموزونی کا شبہ ہُوا ورنہ معنی میں

کچھ اغلاق نہیں ہے۔

بے شک یہ مصرعہ رباعی کے عام اوزان سے ایک علیحدہ وزن رکھتا ہے لیکن ناموزون نہیں ہے رباعی کے اوزان ہی میں یہ بھی ایک وزن ہے۔ مصرعہ موزون ہے اور اسکا وزن عروضی اخرب۔ مکفوف۔ مجبّق۔ ازل۔ مفعول۔ مفاعیلن مفعول فعول ہے اور تقطیع یہ ہے۔

ہر موئے۔ مفعول۔ کہ درد وزل۔ مفاعیلن۔ فی آ اص۔ مفعول۔ نمست۔ فعول۔

جس شخص کو زحافات عروض معلوم ہوں گے اس کو کبھی اس مصرعہ پر ناموزون ہونیکا شبہ نہیں ہوسکتا

راقم

سید معشوق حسین اطہر ثنائی ہاپوڑی وکیل جے پور اسٹیٹ

پھُول

پھُول مایوس دلوں کی اُمیدیں ہیں۔

پھُول وہ الفاظ ہیں جنہیں ایک ننھا بچّہ بھی سمجھ سکتا ہے۔

پھُول خدا کی سب سے پیاری مخلوق ہے جس میں وہ رُوح پھُونکنا بھول گیا۔

پھُول ہماری طرف فقط اشارہ کرتے ہیں لیکن اُن کی اصلی باتیں خدا اور آسمان سے ہوتی ہیں۔

پھُولوں کی خوشبو فضامیں آوارہ رہ کر زیادہ شیریں ہوجاتی ہے جہاں وہ بے خود و بے تاب رہتی ہے جیسے کسی ساز کے نغمے۔

قادرِ مطلق خدا آسمان پر اپنا نام چمکتے تاروں میں لکھتا ہے اور زمین پر ننّھے ننّھے پھُولوں میں۔

پھُول مادرِ قدرت کی پیاری زبان ہے جس کے ساتھ وہ ہم پر اپنی محبت ظاہر کرتی ہے۔

زمین کے تارے یہ پیارے پیارے سُنہری پھُول!

بُت سے پھُول نمودار ہوتے ہیں کہ کھلیں اور اپنی شیرینی ریگستان کی ہوا میں کھودیں۔

پھُول دُنیا کی خوشیاں ہیں۔ اُمید کا ننھا سا موتی "مجھے بھُول مت"!

پھُول حُسن و مسرت اور نکہت و موسیقی کا پیام دیتے ہیں۔

(ماخوذ)

بشیر احمد بیگم

عورت اور مختلف مذاہب

گذشتہ سے پیوستہ

عیسائیت | یہ وہ مذہب ہے جو دُنیا میں پیغامِ امن لیکر آیا تھا، جس نے "خدا کے بیٹے" کو صرف اِس لئے صلیب کی نذر کر دیا، تاکہ انسانیت کا دامنِ حیات گناہِ ازلی کی آلایش سے پاک ہو جائے یورپ کو فخر ہے کہ وہ دُنیا میں اس وقت بہترین حکمران ہے، وہ ہر انسانی جماعت کے حقوق کا احترام کرتا ہے اس کے دربارِ عدل میں مرد، عورت، امیر، جاہل، عام، کسی کی تفریق نہیں ہے، اس کا تمدن دُنیا کا بہترین تمدن ہے، ایک سادہ لوح سیّاح جب پیرس اور لندن کے ایوانِ حکومت میں قدم رکھتا ہے، تو اس کا دل نظامِ جہانبانی کی عظمت و جبروت دیکھ کر دہل جاتا ہے، لیکن جب ہوٹلوں اور گلیوں میں پہنچتا ہے، تو سراپا شرم و عبرت بن جاتا ہے' !

یہودیت نے اگرچہ عورتوں کی حیثیت کو بہت زیادہ پست اور بتذل کر دیا تھا، تاہم انصاف یہ ہے کہ عیسائیت نے جو شرمناک طریقِ عمل عورتوں کے متعلق اختیار کیا، اس کی مثال سے دنیا کی تاریخ بالکل خالی ہے، یہودیت کی طرح عیسائیت نے بھی آدم اور حوّا کے افسانہ کو مذہب کا سنگِ اساس قرار دیا، یعنی سب سے پہلے حوّا نے "ثمرِ ممنوع" کو کھایا اور پھر آدم کو کھانے پر آمادہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں زمین پر پھینک دئے گئے، اور گناہ فطرتِ انسانی کا خاصہ بن گیا، چنانچہ جو شخص عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، گنہگار پیدا ہوتا ہے، اِس لئے عالمِ انسانی ایک ایسے شخص کا محتاج تھا، جو اپنے خون سے اِس کے دامنِ اخلاق کو گناہ سے پاک کر دے، اور وہ انسانیت کا نجات دہندہ حضرتِ مریم کے پیٹ سے پیدا ہوا جس نے صلیب کی نذر ہو کر دُنیا کو گناہ سے بالکل پاک کر دیا، یہ قربانی حضرتِ مسیح کو صرف حوّا کے اس فعلِ شنیعہ کی وجہ سے کرنی پڑی، جس کی بدولت گناہ فطرتِ انسانی میں حلول کر گیا، اِس بنا پر عیسائیت کے نزدیک عورت گنہگارِ ازلی ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ مسیح کے خونِ معصوم کی ذمہ دار ہے، یہی وہ جُرم ہے جس کی پاداش میں عیسائی دنیا نے اس کے ساتھ وہ شرمناک سلوک کیا، جسکو دیکھ کر انسانی شرافت کی آنکھیں شرم سے بند ہو جاتی ہیں،

بڑے بڑے متقی اور خداترس عیسائی بزرگوں مثلاً بزنرڈ، ایَن ٹنی، گریگری، جیرَوم وغیرہ نے جن شرمناک الفاظ میں اس جنسِ لطیف کی تصویر کھینچی ہے، وہ یہ ہے "عورت شیطان کے بازوؤں

کی قوت ہے۔" وہ ایک بچھو ہے جو ہمیشہ نیش زنی کے لئے تیار رہتا ہے۔" وہ مجسم مکر و فریب ہے" وہ تمام اخلاقی معائب کا سرچشمہ ہے۔" "وہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے شیطان ہمارے قلوب پر قبضہ کرتا ہے۔" ایک گنہگار ازلی کی شان میں یہ الفاظ کچھ باعثِ تعجب نہیں!

عیسائیت نے عورت کو مرد سے ہر حیثیت سے کم رتبہ قرار دیا ہے، چنانچہ دنیا کا "شاہزادۂ امن" عورتوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے "تیری خواہشات تیرے شوہر کے تابع رہینگی، اور وہ تیرے اوپر حکومت کریگا" لیکن اس سے زیادہ افسوسناک وہ منظر ہے، جبکہ وہ اپنی مقدس ماں کی شان میں یہ عبرتناک الفاظ استعمال کرتا ہے، "عورت! تو کون ہے؟ مجھ کو تجھ سے کیا مطلب ہے؟"

پولوس مقدس جو عیسائیت کا محسنِ اعظم خیال کیا جاتا ہے، اس نے عورتوں کی حیثیت کو اس سے زیادہ صاف اور واضح کر دیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

"مرد عورت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ عورت مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے"

غرض عیسائیت کے نزدیک عورت ہر قسم کے تمدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہے، اسکی زندگی کا مقصد صرف مرد کی اطاعت و غلامی ہے، انگلش چرچ کے قوانین کے مطابق وہ عملاً ایک ناپاک چیز خیال کیجاتی ہے، چنانچہ وہ منبر اور قربانگاہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتی،

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جبکہ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوکر دنیا کو منور کر رہی تھیں، یورپ میں ایک مذہبی کونسل منعقد ہوئی، جس میں ایک پادری نے یہ سوال اٹھایا کہ آیا عورت واقعی انسان بھی ہے یا نہیں؟ اس نے خود اس کا جواب نفی میں دیا، لیکن دیگر ارکانِ مجلس نے زیادہ تر رحم سے کام لیا، بالآخر کثرتِ رائے نے یہ طے کیا کہ عورت اگرچہ معائب کا مجموعہ ہے، تاہم وہ انسانیت کے دائرہ میں داخل ہے،

انگلستان میں جو اس وقت اپنی عظمت و جبروت کے آگے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے، تیس برس قبل عورتوں کو کسی قسم کا تمدنی یا سیاسی حق حاصل نہیں تھا، اس میں کچھ شبہ نہیں، کہ یورپ میں سب سے پہلے جس ملک نے آئینی حکومت اور سیاسی آزادی کی اہمیت کا اندازہ کیا، وہ انگلستان تھا، لیکن یہ آزادی صرف مردوں تک محدود تھی، چنانچہ جب عورتوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا، تو ایک آواز بھی انکی حمایت میں بلند نہ ہوئی، بلکہ انکے ساتھ وہ برتاؤ کیا گیا جو انگلستان کے لئے ہمیشہ باعثِ ننگ رہیگا، موجود

جنگ کے قبل حق طلبی عورتوں کے لئے تقریباً جُرم کے برابر سمجھی جاتی تھی، چنانچہ علانیہ طور پر حق طلب عورتوں کو مختلف قسم کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، اور جب مردوں کے شرمناک سلوک سے تنگ ہو کر انہوں نے عملی شورش و ہنگامہ کا آغاز کیا، تو اِن کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا گیا، کیا اِنگلستان کو اسی حرّیت پرستی پر ناز ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت بحیثیت مذہب کے چند نا قابلِ عمل اخلاقی اصولوں کا مجموعہ ہے، جو اِنسانی تمدن و تہذیب کے بالکل منافی ہیں، یورپ نے جو کچھ ترقیاں کی ہیں، وہ خود اس کی ذاتی جد وجہد اور سعی و عمل کے نتائج ہیں، جب تک لوگوں کے قلوب پر مسیحی تعلیم کا اقتدار و اثر قائم تھا، اس وقت تک یورپ پر انسانی ترقی کے دروازے بند تھے، لیکن جب مارٹن لوتھر نے چرچ کی جابرانہ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور اس کی آواز یورپ کی فضائے ہستی میں گونجی، تو اس وقت لوگوں کو محسوس ہُوا، کہ عیسائیت محض ایک خوابِ پریشان ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں، اس کے تحت میں رہ کر انسانی ترقی بالکل ناممکن ہے، غرض یورپ نے اب تک جو کچھ ترقی کی ہے، وہ عیسائیت کی غلامی سے آزاد ہو کر کی ہے چنانچہ اَلگزنڈر رسل وِب کہتا ہے،

> "مغربی تمدن عیسائیت کی حقیقی روح سے بالکل غیر متاثر ہے، بلکہ خود غرضی اور نفس پرستی کا نتیجہ ہے، یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے، کہ عیسائی چرچ نے ہمیشہ مغربی ترقی و اصلاح کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں، چنانچہ اس نے ہمیشہ بہی خواہانِ ترقی کو دبانے کی کوشش کی ہے، حقیقت یہ ہے، کہ ہم آج جس چیز کو عیسائی تمدن کہتے ہیں، اسکی ابتدا آٹھویں صدی میں اسپین کے مسلمانوں سے ہُوئی جبکہ تمام عیسائی دُنیا پر جہالت اور تاریکی چھائی ہُوئی تھی"

کیا یُورپ اِن الفاظ کی صداقت کا اعتراف کر سکتا ہے؟

یُورپ کو بے شبہ فخر کرنا چاہیئے، کہ اس نے اپنی مادّی جدت طرازیوں سے دُنیا کو ایک طِلسمکدہ بنا دیا ہے، جسکو دیکھ کر عقلِ انسانی مبہوت ہو جاتی ہے، لیکن جب دیدۂ حق بین مادیّت کے اِس زرنگار پردے کو دفعتہً اُلٹ دیتا ہے، تو اسکو انسانی بد اخلاقیوں کا وہ شرمناک منظر نظر آتا ہے، جس کو دیکھ کر عالمِ کائنات

کا ہر ذرہ عبرت سے کانپ اُٹھتا ہے، چنانچہ لندن اور پیرس کی گلیوں اور سیر گاہوں میں جس بے حجابانہ طریقہ پر عورتوں سے دل لگی کی جاتی ہے، اس کو دیکھ کر ایک خدا ترس انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اب تک قہرِ الٰہی کا سمندر کیوں ساکن ہے!!

عورت خدا کی شریف ترین مخلوق ہے، وہ دُنیا میں مردوں کی غلام نہیں بلکہ شریکِ زندگی بن کر آئی تھی لیکن عیسائیت نے ایک مُدت تک اس کو مردوں کی صحبت کے قابل بھی نہیں سمجھا، چنانچہ ابتدائی زمانہ میں جبکہ یورپ چرچ کی جابرانہ حکومت کا حلقہ بگوش تھا، پادری عموماً تجرد کی تعلیم دیتے تھے، تعددِ ازدواج درکنار، خود عقد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پولوس مقدس نے یہ قانون بنایا تھا کہ پادری کو صرف ایک بیوی کا شوہر ہونا چاہیئے، اسکو عقدِ ثانی نہیں کرنا چاہیئے، جیروم، ایمبروس، اور دیگر مشہور علمائے عیسائیت سب تجرد کے حامی اور معلم تھے، ۵۸۹ئ میں ٹالیڈو کی مذہبی کونسل میں یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کسی عورت کے متعلق کسی پادری پر شبہ ہو، تو جج کو چاہیئے، کہ اس عورت کو بیچ دے، اور روپیہ خیرات وغیرہ میں صرف کردے گریگری اعظم پادریوں اور مذہبی لوگوں کے شادی کرنے کا سخت مخالف تھا، ۱۰۲۲ء میں پینویا کے کونسل میں بینی ڈکٹ ہشتم نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تمام بچوں کو جو پادریوں کے پیدا ہوں، غلامی کی نذر کردینا چاہیئے، یہ شرمناک حالت ۱۶۲۵ء تک قائم رہی جبکہ لوتھر نے اس راہبانہ اور مجرد زندگی کے خلاف عملی شورش شروع کی، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یورپ پوپ کی غلامی سے آزاد ہوگیا، اور لوگوں کو عیسائیت کے معائب کا احساس ہونے لگا، چنانچہ تعلیمیافتہ اور صاحب نظر گروہ کے نزدیک "خدائے مصلوب" کی تعلیمات کے ترانے بالکل بے اثر ہوکر رہ گئے، تاہم عورتوں کی حالت میں کوئی قابلِ اعتناء صلاح نہ ہوسکی،

نپولین اعظم جس کی ساری عظمت و جبروت محض اس کی ماں کے فیضِ تربیت کا نتیجہ تھی، کہتا ہے کہ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے،، لارڈ بائرن جو انیسویں صدی عیسوی میں انگلستان کا بہت بڑا شاعر گذرا ہے، اس نے عورتوں کے فرائضِ زندگی ان الفاظ میں گنائے ہیں،، عورتوں کو صرف خانگی امور کا خیال رکھنا چاہیئے، سوسائٹی سے انکو کوئی تعلق نہیں ہے، انکو مذہب اور کھانے پکانے کی کتابیں پڑھنی چاہئیں، شاعری اور سیاست سے الگ رہنا چاہیئے، وہ رقص و سرود کی محفلوں کی زینت ہیں، انکو کبھی کبھی باغبانی کرنا اور ہل جوتنا بھی چاہیئے،، ایک زرپرست قوم کا شاعر جس کا دماغ صرف مادیت کے دلفریب مناظر کا دلدادہ ہے، بےشبہ عورتوں کو اسی حقارت آمیز نگاہ سے دیکھ سکتا ہے، لیکن ایک ایشیائی شاعر جس کا دلِ لطیف

اور شریفانہ جذبات کا آئینہ ہے، صنفِ نازک کی ایک ایک ادا کو اپنے لئے سرمایۂ حیات سمجھتا ہے، روسو
جو فرانس کا بہت بڑا مصنف گذرا ہے، کہتا ہے۔ "کہ عورتوں کو عموماً کسی فن سے دلچسپی نہیں ہوتی، اِن کو کسی
چیز کا صحیح طور پر علم نہیں ہوتا، اِن میں کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہوتی"، لیکن اِن سب سے زیادہ شرمناک
عورتوں کی وہ تصویر ہے، جو جرمنی کے فلسفی شپن ہاؤر[1] نے کھینچی ہے، چنانچہ کہتا ہے

جس طرح اپنی حفاظت کے لئے ہاتھی کو سونڈ اور شیر کو تیز پنجے دئے گئے
ہیں، اِسی طرح اپنے حصولِ مقاصد کے لئے عورت کو مکاری کا مادہ عطا
کیا گیا ہے، فریب عورت کی فطرت میں داخل ہے، انکا احترام بالکل
مضحکہ انگیز بات ہے، رومن لاء کی طرح اِن کو ہمیشہ ایک ولی کے تحت میں
رہنا چاہیئے، اور ان کو اپنے بچوں پر بھی کسی قسم کا اختیار نہیں دینا
چاہیئے، عورتیں چونکہ عموماً تنگ نظر اور مسرف ہوتی ہیں اس لئے انکو
وراثت میں حقوق سے محروم رکھنا چاہیئے، عورت صرف بچے پیدا
کرنے اور انکی پرورش و تربیت کے لئے بنائی گئی ہے، اور یہی تنہا
اِس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے،

اِن اقوال سے تم بخوبی اندازہ کرسکتے ہو، کہ مسیحی دنیا کے نزدیک عورتوں کی کیا وقعت تھی!
تعددِ ازدواج کو اگرچہ یورپ نے اب تک عملاً قبول نہیں کیا ہے، تاہم اربابِ نظر کے نزدیک
اس کی حقیقت مسلّمہ ہے، چنانچہ لیبان کہتا ہے کہ وحدتِ ازدواج موجودہ عیسائی ممالک میں صرف کتابوں تک
محدود ہے، عملاً اسکا کوئی وجود نہیں ہے، اس سے سوسائٹی کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی، چنانچہ خود فرانس میں
جو وحدتِ ازدواج کا مدعی ہے، ۱۸۲۶ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک زنا میں نو گنا اضافہ ہوگیا، جرمنی کے مصلحین بھی
سولھویں صدی تک تعددِ ازدواج کے قائل تھے، چنانچہ جرمنی کے امرا انیسویں صدی تک برابر اِس
اصول پر عمل پیرا تھے، شپن ہاؤر کا قول ہے کہ "اس وقت صرف لندن میں اسّی ہزار بازاری عورتیں ہیں، یہ
صرف وحدتِ ازدواج کا نتیجہ ہے، اِس لئے تعددِ ازدواج درحقیقت عورتوں کے لئے ایک رحمت ہے،
کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک شخص جس کی بیوی بیمار رہتی ہو، یا تولیدِ نسل کی اس میں صلاحیت نہ ہو، یا
بہت زیادہ ضعیف ہوگئی ہو، دوسری شادی نہ کرے"، غرض یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کہ مغربی

[1] اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں گذرا ہے،

عورتوں کی بداخلاقیوں کا اصلی سبب وحدت ازدواج کا مسئلہ ہے، جس کی آڑ میں رات دن غیر عورتوں کی عصمت دری کیجاتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں ناجائز بچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، چنانچہ آکسفورڈ اور کیمبرج ایسے مہذب اور تعلیمیافتہ مقامات میں حرامی بچوں کی تعداد ہزار میں ۴۵ اور ۵۳ کے قریب ہے، کیا یورپ کو اسی اخلاقی معیار پر ناز ہے؟ یورپ ہمکو طعنہ دیتا ہے، کہ ایشیائی عورتیں اصولِ تمدن سے ناواقف ہوتی ہیں، وہ مردوں کی صحبت میں علانیہ طور پر نہیں بیٹھ سکتیں، وہ زندگی بھر ایک تنگ و تار مکان کے اندر مقید رہتی ہیں، اِنکی ایک ایک ادا سے جہالت اور وحشت ٹپکتی ہے، اِنکے خیالات عموماً تاریک، پست، اور مبتذل ہوتے ہیں، بے شبہ یہ صحیح ہے، کہ ہماری عورتیں ابتک حدودِ تعلیم سے دُور ہیں، لیکن ہمکو فخر ہے، کہ باوجود اس جہالت اور وحشت کے وہ نازنینانِ پیرس کی طرح سر بازار عصمت فروشی نہیں کرسکتیں، ایک یُورپین لڑکی بے شبہ اپنے والدین کی موجودگی میں غیر مردوں کے بوس و کنار کی متحمل ہوسکتی ہے، لیکن یورپ کو اپنی مشرقی بہنوں سے اِس شرمناک بے باکی کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے، وہ حریمِ عصمت کی پردہ نشین ہیں، وہ جہالت کو گوارا کرسکتی ہیں، وہ مادی دلفریبیوں سے بے نیاز ہوسکتی ہیں، وہ دُنیا سے الگ ایک گوشۂ تنہائی میں زندگی بسر کرسکتی ہیں، لیکن انکی غیرتِ انسانی کسی نگاہ بد یا دستِ گستاخ کی کبھی متحمل نہیں ہوسکتی،

غرض یوروپین عورتوں کی اخلاقی پستی اور ابتذال کا حقیقی سبب یورپ کا موجودہ تمدن ہے، جو تمام تر خودغرضی اور مادیت پرستی پر مبنی ہے، جو فضائلِ اخلاق کو دَورِ وحشت کی یادگار سمجھتا ہے، جس کے نزدیک روحانیت ایک صدائے بے معنی ہے، جو صرف اِنسان کے حیوانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے، اس بنا پر اگر دُنیا موجودہ مصائب و آلام سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے، تو اس کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ اس شرمناک مغربی تمدن کو تباہ اور برباد کردے، بغیر اس کے حقیقی امن کی تلاش محض ایک خوابِ پریشان ہے، جس کی کوئی تعبیر نہیں،

سِلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، ہمکو صرف یہ دکھانا مقصود تھا، کہ عیسائی دُنیا نے اخلاقی حیثیت سے عورتوں کے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا ہے، اسکی نظیر دُنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے طلاق عیسائیت نے صرف زنا کی حالت میں جائز رکھی ہے، چنانچہ عدالتوں میں آئے دِن جو شرمناک اِنکشافات ہوتے رہتے ہیں، انکو پڑھ کر ایک خداترس اِنسان کا دل عبرت سے کانپ اُٹھتا ہے، ہمکو یورپ

کی مادّی اور دماغی ترقیوں کا شاندار منظر دیکھ کر اپنی ناداری پر افسوس ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہم کو یہ تسکین بھی ضرور ہے، کہ ابھی تک ہمارے قلب میں شرافت کا احساس موجود ہے، جو اِنسان کے تاجِ کمال کا حقیقی طرّہ ہے،

غرض اِس وسیع خطۂ خاک میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی، جہاں یہ مظلوم ہستی قدر و محبت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی، اس بارِ لطیف کی ذِمّہ داری صرف صحرائے حجاز کے لئے مخصوص تھی، جس کا ایک ایک ذرّہ ابتک دُنیا کے لئے آفتابِ ہدایت ہے، یہ خطّۂ ارض آج یورپ کو اس لئے عزیز ہے، کہ اس کے حدود میں تیل کے خزانے ہیں، لیکن ہمکو صرف اِس لئے عزیز ہے، کہ وہ وحیِ الٰہی کا مہبط اور سرورِ دوعالم کا مولد و مسکن ہے

باقی دارد

مرزا احسان احمد بی اے



زندگی کیا ہے؟ بقائے دوام کا بچپن!

---+---

زندگی ایک چلتا پھرتا سایہ ہے۔

---+---

زندگی خدا کا تحفہ ہے اور اک مقدس شے۔

---+---

زندگی فانی ہے اور فن باقی۔

---+---

دوشتی اور حرص ایک دُوسرے کے جانی دشمن ہیں۔

---+---

حرص عقل کا قید خانہ اور جذبات کی طُوفان گاہ ہے۔

(ترجمہ)

صرف جھوٹ بگاڑ سکتا ہے بنا کچھ نہیں سکتا۔

---+---

صرف بُزدل دروغ گو ہوتے ہیں۔

---+---

دوشیزہ کی زبان نہیں ہوتی بلکہ صرف خیالات!

---+---

سب سے شیریں پھل جو زمین اپنے خالق کے سامنے پیش کر سکتی ہے ایک مکمل انسان ہے۔

---+---

انسان کا مُقدر کیا ہے؟ دُکھ سہنا اور مر جانا!

---+---

د۔ ب

دل دینا

عُشّاق ہر صورتِ زیبا کو دِل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دِل ہمیشہ کسی کی زلف گرہ گیر میں رہا کرتا ہے، داستان گو دِل دینے اور دِل لینے کے افسانے بڑے ذوق وشوق سے سُنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اِس کوشش میں صرف ہُوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دِل دینا ایک نہایت ہی آسان مشغلہ سمجھ لیا گیا۔ اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دِل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دِل دیا۔ نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دِل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دِل دیتے ہیں۔ صد ہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دِلدہی و دلیری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دِل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دِل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے نا آشنا ہیں۔ اِس لئے ہم اس واقعے کو اُن کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دِنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے در پیش تھے۔ اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اُمڈا چلا آتا تھا فرانس میں نواب شانپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کُوسی جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی۔ اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حُسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتابِ رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ دکھایا کہ لارڈ کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ اور ناجائز اُلفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا

مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اِسی اثنا میں نواب شانپین تیار ہُوا کہ ارض مقدس میں جاکر مُسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے جو مجاہدینِ فرانس اُس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے اُن کے زُمرے میں لارڈ کُوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اِس ارادے کی خبر جب اُس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقۂ دلنواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دِل میں کہا "اچھا ہے۔ لارڈ کُوسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتشِ رقابت ٹھنڈی پڑ جائیگی۔ اور شاید اُن کی بدگمانیاں دُور ہو جائیں"۔

اِس کے بعد ہنسی خوشی عاشقِ دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا۔ اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ۔ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں۔ کچھ جواہرات تھے۔ اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا۔ اور اُس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہُوئے تھے۔ ان دنوں یُورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی وضع تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوب صُورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے۔ اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی تھی۔ الغرض بصد حسرت واندوہ عاشق و معشوق جُدا ہُوئے۔ اور لارڈ کُوسی نے شانپین کے نواب کے ہمراہ ارضِ مقدس فلسطین کی راہ لی ۔

یہ ۵۸۷ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکّہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مُسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقتِ عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی۔ اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سُلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہُوئے تھے۔ خونریزیوں کا سِلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے ۔

نواب کُوسی نے نئے مجاہدینِ فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور و شور سے دھاوے کرنے لگا۔ اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں پتھروں اور آتش باری کے قمقموں کو ڈھال پر لینا ہُوا عکّہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا۔ اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مُسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آرہا۔ اور لوگ

فوراً خیمے میں اُٹھا لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ کوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبۂ جاں نواز یاد آئی اور اِرادہ کیا کہ زندگی کے اِن باقیماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا۔ اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا "میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دِلدارِ مہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اُس نے مجھے یادگارِ محبّت کے طریقے سے دی تھیں اُسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کرکے میرا دل نکالنا۔ اور اُس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے۔ اور اس کو بھی لیجا کر اُسی آفتِ جاں کی نذر کر دینا"

یہ وصیتیں کرکے لارڈ کوسی مر گیا۔ اور وفادار ملازم نے ان پر پُورا عمل کیا۔ سفر کرکے فرانس میں پہنچا۔ اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھُپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اُس کی محبُوبہ کے حوالے کرے۔ اِسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کوسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اُس کے سر پر جا پہنچا اور کہا "سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے ورنہ تیری جان کی خیر نہیں" ملازم نے قسمیں کھا کر کہا "میرے مالک تو ارضِ مقدس میں مُسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے اب پیام دینے والا کون ہے؟" لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اُسکے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا "بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹتا ہوگا" خادم سہم گیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اور جان کے خوف سے ساری باتیں قبول دیں جو چیزیں ساتھ لایا تھا اُس کے سامنے رکھ دیں۔ اور لارڈ کوسی کا خط بھی اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصّے کی اِنتہا نہ تھی۔ اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا اِنتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باورچی کو بُلایا۔ اور وہ لارڈ کوسی کا دِل اُس کے ہاتھ میں دیکر کہا اُس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ" کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر اُن کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا "تمہارے شوق کے مطابق اِن کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے" بیوی نے اُن کبابوں کو بڑے شوق سے لذاحت

لے لے کر کھایا۔ اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہرخند کے ساتھ پوچھا "کیسے پکے ہیں؟" جواب ملا کہ "بہت اچھے پکے ہیں۔ اور مجھے بہت مزہ آیا۔" کہا "ہاں یہ مزہ آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اسکو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دِل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟" لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگزشت من وعن بیان کر دی۔ اور بیوی کے دئے ہُوئے یادگارِ محبت تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نِکال کے سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی۔ اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اُس کے خون شدہ دُکھے دِل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہُوا۔ مگر ضبط کیا۔ اور استقلال کے تیوروں سے بولی "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دِل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دِل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دِل کا مقبرہ بن گیا ہے لہٰذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی۔ نہ اس اچھے دِل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی" یہ کہتے کہتے پُرحسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز مُلکِ عدم کی راہ لی۔

محمد عبدالحلیم شرر

قابلیت اک ذمہ داری ہے۔ قوت کے ذرے ذرے میں فرض پنہاں ہے!

قابل آدمی کی ہمت نرم لفظوں اور پختہ کاموں میں نظر آتی ہے۔

سب وہ کام کر سکتے ہیں جو کسی نے کیا ہو۔ ۱

ب

زبیدہ

زبیدہ اپنی زندگی کی نیند پُوری کر چکی اور اب کسی زیادہ مستقل اور حقیقی دنیا میں جاگ رہی ہے۔ لامتناہی زندگیوں کے ظُلمات میں سے تگ و دو کر کے میرے حافظے کی آسمانی روشنی پر صدیاں اور قرن ایک بھاری اور اندھیری کُہر کی طرح بیٹھ چُکے ہیں۔ لیکن میرا فرسودہ دماغ تخیل کی شدت سے تپ کر اُس روشن تاریکی۔ اُس پُرشور سکوت کو ایک لطیف تصور کی جھلک کی طرح یاد کر سکتا ہے۔ جب میری اور زبیدہ کی روحوں نے اپنے تجرّد کے عالم میں محبت کا سا مستقل پیمانِ وفا باندھا تھا۔

شادی کے بعد میری رُوح نے زبیدہ کی سیاہ اور تیز آنکھوں کی گہرائیوں کو دیکھا۔ تو اُس سکوتِ تحیّر میں میرے سُن حافظے نے پہلی مرتبہ ایک کروٹ لینے کی کوشش کی۔ اور ماضی کی اُس ویران تاریکی۔ اُس مہیب چُپ چاپ۔ اُس عظیم خود فراموشی پر دوبارہ نظر ڈالنی چاہی۔ جس میں زندگیاں آئیں۔ اور گزر گئی تھیں خوابوں میں خواب دِکھائی دئے اور مٹ گئے تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ وہ رفاقت جو اس کی آنکھوں میں ایک پیمانِ ازل بن کر روشن تھی کہاں کہاں میری ہم سفر رہی ہے۔

مجھے اپنی آواز اپنے کانوں میں آئی "زبیدہ! میں تمہیں جانتا ہوں" اور زبیدہ کے ہونٹوں نے ہلکے سے کہا "تم اس خواب کی تعبیر ہو۔"

زبیدہ کا وسیع مطالعہ اور اعلےٰ تعلیم اس فطری شوق کا نتیجہ تھا۔ جس نے اس کی آنکھیں تمام مشاغل اور دلچسپیوں سے ہٹا کر کتابوں کے صفحوں پر لگا دی تھیں۔ عورتوں کا وہ مرغوب شوق جسے سنگھار کہتے ہیں۔ اس کے لئے مطالعہ سے زیادہ دلفریبی نہ رکھتا تھا۔ تزئین بھی اس میں ایک عجیب رعنائی پیدا کر سکتی تھی۔ لیکن اس کا حُسن میرے نزدیک سنگھار سے بے نیاز تھا۔ اس کا قد کسی قدر لمبا تھا۔ اس کا چہرہ بیضاوی اور رنگ کُندنی۔ تمام چہرے میں اس کی بادام نما سیاہ اور گہری آنکھیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اِن میں سے ایک ایسی تیر سی تیز نظر نِکلتی تھی۔ جس کے سامنے ضمیر مجرم تھرتھرا اُٹھے جو نقابوں کو پارہ پارہ کر ڈالے۔ اس کی پلکیں باہم مِلتیں تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک دنیا تھی۔ کہ سو گئی ہے اس کی بھوؤں کے قوس بہت واضح تھے۔ ناک کا حُسنِ تراش کچھ اِس قسم کا تھا۔ کہ اِس کا پُورا لُطف

اسے پہلو سے دیکھنے میں آسکتا تھا۔ اُس کے ہلکے گلابی ہونٹوں پر کوئی حسرت آمیز تمنا برستی تھی۔ اسکے کالے سیاہ اور لمبے بال سیدھے تھے۔ اور کچھ کچھ پیشانی پر جھکے رہتے تھے۔

آہ میں کس قدر کہتا تھا" زبیدہ! مجھے ایک تصویر اُتار لینے دو۔ اس طرح کہ تمہارا چہرہ تمہارے شانے کی طرف پھرا ہُوا ہو۔ اور اس کی نفیس تراش کا حُسن واضح دکھائی دے رہا ہو۔ تمہاری نظریں جھکی ہُوئی ہوں۔ اور ایک نازک بُندے کا دُردانہ تمہارے گھنے اور کھلے ہُوئے بالوں میں سے جھانک رہا ہو میں تمہیں تمہارے پیچھے کھڑا ہو کے دیکھوں اور اس شکیب سوز منظر کو ایک تصویر میں محفوظ کرلوں۔

مگر وہ مُسکرا کر کہتی" اور اگر اس وقت ہم اپنی زندگی کے خوابوں کی منزلوں میں سے جاگتے چلے جائیں" میں تھرتھرا اُٹھا کرتا۔ مجھے زندگی کے خواب کا نازک جال لرزتا ہُوا معلوم ہوتا۔ زندگی کی آرزوئیں اور ارادے اس کے فلسفۂ حیات کے مقابلے میں کس قدر ذلیل اور گرے ہُوئے نظر آتے۔

زبیدہ کا یہ فلسفہ صرف مطالعہ کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس فلسفے کو ساتھ لیکر دُنیا میں آئی تھی۔ اسی قسم کے خیالات اس کی اوائل عُمر کی خواب ناک حیرت کے رفیق تھے۔ وہ پہلا اہم مسئلہ جس نے اس کے شعور کو مصروفِ جستجو کیا۔ ماضی و استقبال کی پُراسرار تاریکی تھی۔ وہ ہمیشہ حافظہ پر زور ڈالتی کہ وہ کہاں سے آئی اور کہاں کو جا رہی ہے۔ یہ کیا ہے۔ کہ دو لامتناہی اندھیروں کے درمیان صرف ایک ذرا سی جگہ پر روشنی کی جھلک پڑتی دکھائی دیتی ہے! کیا اِنسان محض ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح سے ہے کہ ایک افق سے اُٹھ کر دُوسرے میں ڈوب جائے۔ یا اس کی ہستی میں کوئی معنی۔ اس کے ظہور میں کسی سِلسلہ کا تسلسل مضمر ہے۔

جبلّت اس کو اپنے متعلقین کی ہستی میں زندگی کی دیواروں سے باہر کی کوئی محبت اور نفرت یاد دلاتی تھی۔ وہ محبت اور نفرت جو اس کی زندگی کے نہایت واضح جذبے تھے۔ جو اسے پہلی نظر میں پیدا ہو جاتے تھے۔ اور وہ انکشاف کی اس دھار کے ساتھ ساتھ جو ماضی کی تاریکی میں سے نِکل کر حال کی روشنی میں مُسکراتی تھی۔ زندگی کے ماخذ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسی معمے کو سُلجھانے کے شوق میں وہ مطالعہ کی طرف راغب ہُوئی۔ اور قدیم یُونانی فلسفے کے سمندروں میں غرق ہو گئی۔ وہ علوم جن کا تعلق عمل سے تھا۔ اسے کبھی پسند نہ آئے۔ وہ کہتی چشمک برق اور تبسم شرار میں کس چیز کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟ اسے صرف ذہنی علوم سے شغف تھا۔ اور ان میں سے بھی خصوصاً وہ جن کا تعلق روح کی ماہیت۔ عالم کون و فساد

کی توجیہ سے تھا۔ اِن میں اسے بہت سے ایسے خیالات مل گئے۔ جو اس کے دِل و دماغ میں بے قرار رہتے تھے۔ اور اس کے قیاسات نے یقین کی صورت اختیار کرلی۔

اس دیوانہ وار جستجو کی تھکن وہ موسیقی سے فرو کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شاید اس کی موسیقی کو بھی اس کشمکش سے قریبی تعلق تھا۔ جس میں اس کا دل و دماغ مصروف رہتا تھا۔ اس نے ایک عجیب موسیقی اِیجاد کرلی تھی۔ جو کانوں کے لئے کوئی خوش آئیند آواز نہ تھی بلکہ بدن کے روئیں کھڑے کردیتی تھی۔ وہ ایک معطر نیند کی طرح دماغ پر مسلط نہ ہوجاتی تھی۔ بلکہ دماغ میں عجیب مبہم خیالات بحالتِ بے قراری بیدار کرتی تھی۔ اگر اِس کی مدھم آوازوں کی ہیبت ناک لرزشیں دنیائے شہود کے پیچھے پیچھے رہنے والی حقیقت سے ہم آہنگ ہونا چاہتی تھیں۔ تو بلند آوازوں کا دردو کرب وحشت کے عالم میں پردۂ ہستی کو چاک کرتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسیقی کو اتنی ترقی دی جاسکتی ہے کہ اِس کی لَے میں یہ کائناتِ خواب پگھل کر بہ جائے۔

شادی سے پہلے اس کے سرود میں مشرقی موسیقی کی مانند ایک تلاش تھی۔ شادی کے بعد مغربی موسیقی کی بے قراری۔ وہ کہتی "شادی سے پہلے مجھے معلوم تھا کہ میں اور تم یکجا ہوجائیں گے۔ میری زندگی کا مقصد تمہاری تلاش تھا۔ میں ماں باپ سے محبت کرنے کو پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ تمہاری تلاش کا ایک ذریعہ تھے۔ میں تمہیں واپس لے جانے کو اِس دنیا میں آئی تھی۔ اگر خدانخواستہ میں تمہیں حاصل نہ کرلیتی۔ تو یقیناً اس پریشان خواب سے جاگ اُٹھتی۔

اس کی اِن باتوں سے میری آنکھیں تپ جاتیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے پھُوٹ آتے دُنیا ایک تصویر کی طرح کھڑی ہُوئی معلوم ہونے لگتی۔ اور دماغ میں کوئی چیز نقاہت کے عالم میں اُٹھنے کی کوشش کرتی۔ میں ڈر کر کہتا۔ "زبیدہ یہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں؟"

اور وہ جواب دیتی" خواب میں۔ میرے پیارے خواب میں۔ جس طرح اس زندگی سے ہم خواب کی چھوٹی چھوٹی سینکڑوں دُنیاؤں میں ہو آتے ہیں۔ اسی طرح گزشتہ زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایک چھوٹا سا خواب ہے۔ اور نہ جانے ایسے ایسے کتنے اَور خواب ہم اس زندگی میں دیکھینگے اور وہ زندگی ایک اُس سے پہلی زندگی کے بہت سے خوابوں میں سے ایک چھوٹا سا خواب ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ ازل سے جاملتا ہے۔ ازل اور ابد ایک ہیں۔ ازل سے ہم زندگیوں

میں بڑھتے آرہے ہیں۔ اور پھر ابد میں ہم بیدار ہو جائیں گے۔ عالمِ خواب کے نظام اور ان میں داخل ہونے کے طریقے مختلف ہیں۔ موجودہ زندگی کے خواب میں ہم ماں باپ کے ذریعے داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اِس زندگی کی نسبت سے جو خواب ہیں ان میں، ہم ماں باپ کی امداد سے بے نیاز ہیں وہ عمر موجودہ زندگی کی نسبت سے ذراسی ہو۔ لیکن گزشتہ زندگی کے مقابلے میں اس زندگی کا خواب یہی حیثیت رکھتا ہے +

مَیں کہتا زبیدہ بس کرو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میرا دماغ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

اور وہ کہتی "تو پھر میرے پیارے۔ جب تک ہم اس خواب سے نہ جاگیں آؤ۔ ہم وہ باتیں کریں جو اس کے لئے موزوں ہیں + آؤ ہم اس خواب کی تمام اُلفتوں سے اپنے سینے لبریز کریں۔ چاند کی روپہلی روشنی میں پھولوں کے معطر سائے میں بیٹھ کر میں تمہیں اپنی محبت سُناؤں اور سُورج کی سُنہری روشنی میں کسی گنجان پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑی کی خنکی میں تم اپنی محبت مجھ سے کہو + ہم اپنی محبت کے مدارج میں ترقی کرتے جائیں۔ ہم چاند اور سُورج۔ زمین اور آسمان کو اپنی محبّت سے تھکا کر ایک وہم بنا دیں۔ زندگی کا یہ طلسم توڑ دیں۔ ہماری محبّت کے بلند آہنگ گیت سازِ حیات کے ایک ایک تار سے بے نیاز ہوتے ہوئے آخر صرف ہماری رُوح میں شعلہ بن کر سما جائیں۔ اور ہم حقیقت میں بیدار ہو جائیں +

میرا تیز اور سہما ہُوا تنفس اس سے پُوچھا کرتا" اور زبیدہ۔ اگر ہم میں سے کوئی پہلے جاگ اُٹھا"

وہ ہنس کر جواب دیتی "تو وہ دوسرے کو جگا دے گا"

میں کہنا چاہتا "لیکن زبیدہ ——"

اور وہ ہنستی "میرے پیارے ڈرومت۔ خوشگوار خواب سے کوئی جاگنا نہیں چاہتا لیکن جاگنے کے بعد خواب کی تمام دلفریبیوں کی قیمت صرف ایک تبسّم ہوتی ہے"

مَیں پھر کچھ کہنے کو بے قرار ہوتا "میری زبیدہ ——"

اور وہ پھر بات کاٹ دیتی "مگر میرے پیارے تم اس خواب کی دلفریبیوں کو اپنے اوپر اثر ہی نہ کرنے دو۔ ورنہ تم اس عظیم سِلسلہ سے ٹوٹ کر الگ ہو جاؤ گے اور ایک چھوٹے سے ذلیل اِمتحان میں پھنس جاؤ گے + اِس جھوٹی زندگی کی تمام لعنتیں تم کو اپنی آماجگاہ بنالیں گی تم سمجھ لو

کہ تم ایک سایہ ہو۔ پھر تم تمام مصیبتوں۔ تمام بیماریوں۔ تمام خوشیوں۔ بلکہ موت تک سے بھی بالا ہو گئے۔ تمہیں ایک سیاہ جالی کے پردے میں سے گزشتہ زندگی کے مدھم نقش دکھائی دیتے رہینگے میرے پیارے میری تشنۂ اُلفت رُوح کو اس زندگی کی نسبت کسی زیادہ حقیقی زندگی میں سیراب کرنیکو چلو"

آہ مجھے اس کی باتوں کی تہ میں ایک خوفناک حقیقت سرسراتی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیا کرتا۔ لیکن اس کے الفاظ کسی افق کے اس پار سے آنے والے گھنٹے کی آواز کی طرح میرے کانوں میں گونجتے رہا کرتے۔ مکان کی پختہ دیواریں ایک نازک کرب معلوم ہونے لگتیں جنہیں میری انگلی کا مس منہدم کر سکتا تھا۔

اور زبیدہ ایک قوی روح جو اس خواب کے پیچیدہ جال کی اُلجھنوں میں سے مخلصی دلا کر پھر مجھے کسی حقیقت کو کھینچ لے جانے کے لئے آئی تھی دُنیا کی مادیت کے درمیان ایک ایسے مسلح سپاہی کی طرح کھڑی تھی جس پر تیروں کی بوچھاڑ پڑ رہی ہو مگر اس کی آنکھوں کا تبسم انکو اپنے سے ٹکرا ٹکرا کر ذلت اور عاجزی سے نیچے گرتا ہوا دیکھے۔ بیماریوں نے اس کی کمزور صحت پر حملہ کیا مگر اس کی اجیت روح سے کھسیانی ہو کر پھر گئیں۔ عیش و عشرت اور تنعم نے میرے گھر میں اس کے لئے دامن پھیلایا۔ مگر اس کی مستغنی رُوح نے اس کی تضحیک کی۔ ماں باپ کی وفات کے صدمے نے سیاہ بادل کی طرح اس کے سر پر سیاہی پھیلائی۔ مگر اس کی سنگینیٔ استقلال نے اسکو ایک نظر دیکھا۔ اور وہ پارہ پارہ ہو گئے۔ وہ ایک سرکش شعلہ تھی۔ جسے حوادث کی پھونکیں نہ لرزا سکتی تھیں۔ جس کی فنا و بقا کسی عظیم قوت کے منتظم ہاتھوں میں تھی۔ اور آخر وہ شعلہ بجھ گیا۔ یک لخت جیسے کوئی خواب سے چونک پڑے۔ زبیدہ جاگ اُٹھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ قدرت ایسی ظالم نہیں۔ کہ ازل آشنا روحوں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دے۔ یہ خواب ہے خواب! زبیدہ کا خواب ختم ہو گیا۔ میں اس خواب میں اپنے آپ کو بھول جانے کا آرزومند تھا۔ وہ اپنے آپ کو ڈھونڈھ لینا چاہتی تھی۔ میں دوسری قوی روح کو بھی اپنے ساتھ برباد کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک گزشتہ زندگی کا پیغام تھی میں حقیقتِ عظیم سے آشنا ہونے کے قابل نہیں۔ مجھے اس کا کفارہ ایسے ایسے کئی ہوس انگیز خوابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو ہو کر ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن آہ بیداری۔ بیداری۔ اس مرتبہ بیداری! زبیدہ سے ایک عارضی

لیکن حقیقی قرب مجھے آئندہ زندگی میں دھوکا نہ کھانے دیگا۔ زبیدہ کی رُوح کو دُوسرے اِمتحانوں میں میرے پیچھے پیچھے ندائے غیب بن کر نہ آنا پڑے گا۔ میں حقیقت کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دوں گا۔ میں پتھر بن جاؤں گا۔ بس میں جاگ اُٹھوں۔ اس خواب سے جاگ اُٹھوں۔ یہ خوابِ پریشاں میرے تھکے ہُوئے دماغ کی برداشت سے باہر ہے میں بیدار ہونا چاہتا ہوں۔ جگادے۔ زبیدہ مجھے جگادے کیا ایک دوسری زندگی میں مجھے سویا ہُوا دیکھ کر تو میری بے بسی پر ہنس رہی ہے؟ میرے خود بخود جاگنے سے پہلے مجھے جگادے۔ اسی طرح جیسے تو ایک رات میں یک لخت جگا لی گئی۔ اف وہ کیسی خوفناک رات تھی۔ دُنیا کا رنگ ایک مضبوط رُوح کو اپنے افسوں سے متاثر ہُوئے بغیر رخصت ہوتے دیکھ کر فق تھا ہوا ساکت تھی۔ اور فضا ملول۔ آوازیں اور روشنیاں کمزور اور مکدر۔ میری روح میرے سرد جسم میں سے نکل کر کسی غیر محسوس چیز سے چمٹ جانا چاہتی تھی۔ اور میں اپنے بہت بڑے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا اپنے دل کے مبہم خدشوں کو ایک اخبار کے مطالعے میں فنا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوکر چاکر سو گئے تھے۔ زبیدہ شاید اپنے کمرے میں تھی۔ اور میں تنہا۔

بار بار مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس چُپ چاپ میں کوئی بھاری پردوں میں سے سرسرا کر گزر گیا۔ دیواروں پر بڑے بڑے فریم چیخنے۔ کسی پوشیدہ ہاتھ نے گھڑی کی آواز کا دم گھونٹنا چاہا۔ میں ڈرتا ڈرتا پلکیں اُٹھاتا۔ اور رنجیدہ سکوت کو دیکھتا۔ تمام سامان ڈوبا سا جا رہا تھا۔ چیزوں کے گرد ایک ہلکی ہلکی کہر تھی معلوم ہوتا تھا۔ فرنیچر اس کُہر میں سرک رہا ہے۔ مگر میرے دیکھتے ہی تھم جاتا ہے۔ سامنے انگیٹھی میں آگ کے شعلے کسی بلّی کی پُراسرار آنکھوں کی طرح میری طرف تک رہے تھے۔ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہُوا ماتھے پر تیوری چڑھائے مجھے غصّے سے گھور رہا ہے۔ اور میں ان دہشت ناک اوہام میں گھرا ہُوا سہم کر بیٹھا تھا۔ کہ پردے سرکے اور مجھے زبیدہ دروازے میں کھڑی ہُوئی دکھائی دی۔ لیکن اپنے سفید شب خوابی کے لباس اور لمبے سیاہ بکھرے ہُوئے بالوں میں وہ ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ایک سُست رفتار دُھوئیں میں اس کا چہرہ ساکت ہے۔ اس کی نظریں میرے دِل میں اُتر کر کچھ کھینچ رہی تھیں +

میں نے اپنے خشک تالو سے بمشکل آواز نکالی" زبیدہ تم ابھی جاگ رہی ہو؟

زبیدہ نے کہا۔ شاید اس کی آنکھوں نے کہا،" میں سو چکی۔ میرا دل ساز بجانے کو چاہتا ہے"

بہت دُور سے ایک آواز ہوا میں لرز رہی تھی۔ "زبیدہ سو چکی"
شاید اِس آواز میں مقسومِ انسانی بول رہا تھا۔ کہ سُنتے ہی میرا دماغ ٹھنڈا ہو کر جم گیا۔ اور مَیں اَور کچھ نہ سُن سکا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اور پھر میرا دماغ چکر کھاتے کھاتے اس وقت ساکت ہُوا جب اِس کے ساز کی مدھم ہیبت دردِ کرب کی اونچی چیخوں میں بدل چکی تھی۔ دُنیا کے خواب کا طلسم چیخ رہا تھا۔ غیر مرئی دنیا سے آزاد روحوں کے قہقہے بیدار ہو چکے تھے۔ سُنسان رات میں چھت کے اُوپر جیسے بہت سے قدم دَوڑ رہے تھے۔ کمرے کے پردوں کے پیچھے کوئی حقیقت ظاہر ہونے کو لرز رہی تھی۔ اور میری آنکھوں کی دہشت باہر اُبل پڑنا چاہتی تھی۔ مَیں اُٹھنا چاہتا تھا کہ زبیدہ کا ہاتھ پکڑ لوں۔ مگر ایک مضبوط گرفت نے مجھے کُرسی کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ اور میرے ہاتھ کُرسی کے بازوؤں کو نوچ نوچ کر رہ جاتے تھے۔
ساز کی تیز باریک آواز میری رُوح کے بندھن کو کاٹ رہی تھی۔ مَیں اِس خواب سے بیداری کی سطح تک پہنچ چکا تھا کہ ساز کے تار ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ ٹُوٹ گئے۔ کمرے کی دیواریں دروازے اور شیشے یک لخت تھرتھرائے۔ زمین کے نچلے طبقات میں سے لاتعداد روحوں کے کراہنے کی گرج سُنائی دی۔ سطحِ زمین نے ایک کروٹ لینے کی کوشش کی۔ آسمان پر تڑاق تڑاق ستارے ٹُوٹے اور ٹُوٹتے چلے گئے۔ اور پھر اندھیرا۔ سناٹا۔ ویرانہ ـــــ زبیدہ اس خواب کے رنگین جال سے آزاد ہو چکی تھی۔

اور اب میری رُوح پر ایک سفید بھاری۔ برف سے ہاتھ کا بوجھ ہے۔ لمبی لمبی چھپی ہُوئی اُنگلیاں میرے سینے کی گہرائیوں میں کسی چیز کو ٹٹول ٹٹول کر باہر کھینچ لینا چاہتی ہیں۔ زبیدہ مجھ کو جگا رہی ہے شائید اس گہری نیند سے بیدار کرنے کے لئے مجھے جھنجھوڑ رہی ہے۔

سیّد امتیاز علی تاج

تاروں کی دُنیا

تاروں کی دُنیا میں خدا جانے وہ کیا ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے؟ وہ کیا ہے جسے دیکھ کر اک مطمئن اضطراب دلِ غمدیدہ میں جاگزیں ہو جاتا ہے؟

مَیں دیکھتا ہوں کہ اِن تاروں میں کچھ ایسے ہیں جو ساکن و خاموش رہتے ہیں جیسے غم کی مایوسی!

اور کچھ دُھندلے اور دُور دراز جیسے گئے گذرے دنوں کی یاد!

کچھ روشن و تاباں ہیں جیسے کسی پاک وصاف دل رکھنے والی محبُوبہ کی آنکھیں!

اور کچھ ٹمٹماتے ہیں، جیسے اُس ماں کی محبت بھری نگاہیں جو آبدیدہ ہو کر اپنے بچھڑے ہُوئے بچّوں کو پُکارتی ہو!

تو کیا اِن آئینوں میں حیاتِ انسانی عکس ریز ہے؟ ۷.۹

یا کیا یہ چراغ اپنی روشنی میرے رنج و راحت پر ڈالتے ہیں اور ہر رات اپنے اِشاروں میں میری زندگی کی گوناں گوں کہانی سُناتے رہتے ہیں؟

اور اگر یہ نہیں تو پھر اِس تاروں کی دُنیا میں اَور کیا ہے جو مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے؟ جسے دیکھ کر میرا دِل کبھی شاداں ہے اور کبھی رنجور!

مَیں جانتا ہوں کہ میں اِک مسافر ہوں رہِ راست سے بھٹکا ہُوا اور گو فطرتاً آزاد روش ہوں لیکن خواہشاتِ رنگیں سے محصور!

گُوناگُوں دلچسپیوں کا پُتلا ہوں لیکن اسرارِ خودی سے بے خبر!

ہر شے کا متلاشی رہتا ہوں لیکن حصولِ مدعا پر اپنی آرزو سے بیزار! ——— میرے دِن دلچسپی سے خالی ہیں اور میری فضا پروازِ تخیّل کے لئے تنگ اور ناموزوں!!

لیکن

اِک تنہا سامانِ مسرت میرے لئے موجود ہے کہ ہنوز میری راتیں اِسی سوچ میں کٹتی ہیں کہ حُسن کے

اِن ننھے روشن کھلونوں میں کیا وہ روشنی عیاں و پنہاں ہے جسے میری تاریک و نابینا قسمت ڈھونڈتی ہے؟
کیا وہ عصمت ہویدا و پوشیدہ ہے جسے میرا گناہ آلود ضمیر تلاش کیا کرتا ہے؟
کیا وہی راز منظور و مستور ہے جس کے لئے میرا نفس خراب و خستہ حال ہو رہا ہے مگر سرگشتگی سے پناہ کہیں نہیں؟ ــــــــ اور اگر یہ نہیں تو پھر تاروں کی اس دُنیا میں اَور کیا ہے جو مجھے اپنی سمت کھینچتا ہے؟

یہ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا سب سے اٹل جذبہ جذبۂ عشق اور کائنات کا صادق ترین جلوہ جلوۂ حُسن ہے۔ اور مجھے اِس کا احساس بھی ہے کہ جب میں اِن دُور دراز روشنیوں پر نگاہ دَوڑاتا ہوں تو میری محبّت تلاطم میں آجاتی ہے اور میری ساری زندگی درہم برہم نظر آنے لگتی ہے! اُس وقت میرا دل جان لیتا ہے کہ اُس نے قابلِ حصول آرزوؤں کے تعاقب میں قوتِ ضبط کو کھو دیا، اپنی انمول فطرت کو سیم و زر کے بدلے بیچ ڈالا۔ اور محبّت کو جہاں مروت کا نام و نشان نہ تھا بکھیر دیا!
اِک عُمر یُونہی کٹی کہ میں نے محبّت کو غرض کے ساتھ ہمکنار پایا، وفا کو جفا سے دوچار ہوتے دیکھا، ضمیر کو اپنے ہی نفس سے دست و گریباں ہوتے نظّارہ کیا! میرے دن یُونہی گذر گئے! ــــــ افسوس!
ــــــ لیکن صد شکر کہ اِک تنہا سامانِ انبساط میرے لئے باقی ہے کہ ہنوز میری راتیں اُن حسین روشنیوں سے معمُور ہیں جن کے پرتو نے دلِ حزیں میں اک اچھوتی آرزو پیدا کردی! میں نے جان لیا کہ آرزو حصول کے لئے نہیں کہ عشق حقیقی وہ ہے جو وصل سے نا آشنا رہے کہ حیاتِ انسانی کا صحیح سکون سکونِ اضطراب ہے!!
میں نے جانا کہ سچّی کشش وہ ہے جو ہمیشہ دل کو اپنی طرف کھینچتی رہے! سچّی آرزو وہ ہے جو تکمیل کی متجسس نہ ہو اور سچّی محبّت وہی ہے جو مدعائے محبّت کے لئے جدوجہد کرتی رہے اور اِس جدوجہد ہی کو مآلِ حیات تصور کرے!!

مَیں کیا ہوں ؟

پھُولوں سے بارہا پُوچھا۔ سُنا، سمجھا سب نے۔ گردن ہلاتے بھی نظر آئے مگر ہمیشہ مُسکرا کر چُپ رہے۔ اے ظریف طبع پری زادو! تمہیں سب کچھ معلوم ہے مگر تم بتاتے نہیں۔

بادلوں سے۔ کِن بادلوں سے؟ وہ جو شبِ ماہ میں چاندنی کی جھولیاں بھر بھر بچپن کی ادا لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں بارہا یہی سوال کیا مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر کہ پھر ملیں گے تو بتائیں گے ٹالتے رہے۔

تاروں سے۔ اُن پیارے تاروں سے جن کی پیامِ محبوب رساں کرنیں ولولہ انگیز ہی تخیّل پروری کی سحر کاریاں کرتی ہیں برسوں یہی تکرار رہی مگر نتیجہ ندارد!

پھُولوں میں، بادلوں میں، تاروں میں ایک ہی سازشِ خموشی کا اثر ہے۔ یہی میرے دوست ہیں اور یہی دلدادۂ حسنِ ستم روائی!

کیا کروں! کس سے پوچھوں؟

ہاں! وہ ایک بھولی بھالی لڑکی پانی بھرنے لئے گاگر سر پر تولے ہُوئے دامنِ کوہ والے چشمے کی طرف خوشی خوشی جا رہی ہے۔ کیا مجھے معلوم ہوتا ہے یا واقعی زمین اُس کے پاؤں چُوم رہی ہے؟ نہیں نہیں! سچ مچ پگ ڈنڈی کے اِدھر اُدھر کے پھُول اُس کی طرف جُھک رہے ہیں۔ اے لو! دیکھو! وہ چھوٹی چھوٹی شرمیلی جھاڑیاں جھوم جھوم کر اُن پر نظر کا دم کر رہی ہیں۔ اُسے دیکھ کر ایک کبوتر نے خوشی سے بازی لگائی۔ چڑیاں ناچ کرنے لگیں۔

ارے! ایک دلیر تنکے نے لپک کر اس کا دامن جا لیا۔ ہیں ہیں وہ اسے کیا کہہ رہا ہے؟

تنکا:۔ آپا تم کل کیوں نہ آئیں؟

لڑکی:۔ لو! اُلٹی بات۔ مَیں تو کل آئی تھی، تم میں سے کوئی تھا ہی نہیں!

تنکا:۔ یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے؟ آپ نے کل وہ برقع پہن لیا ہو گا جس کی تاثیر سے بھولی لڑکیاں ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

لڑکی۔ کیسا برقع؟
تنکا۔ بی آپا بُرا نہ مانو تو صاف صاف کہہ دوں۔
لڑکی۔ (مسکرا کر) بھائی! تمہاری دِل لگی کی عادت نہ گئی۔ میں اور تمہاری بات کا بُرا مانوں؟
تنکا۔ بی آپا۔ اِس بُرقع کا نام خود بینی ہے۔
ارے غضب پھر تم نے وہی پہنا۔ اچھا رخصت!

یہ کیا ہُوا؟ پھُول تنکے۔ جھاڑیاں کبوتر چڑیاں سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ اس بھولی لڑکی کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ چلوں اس لڑکی سے پوچھوں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ نہیں کیا پوچھنا ہے۔ نہ اس کی وہ چال ہے نہ وہ نگاہ ہے۔ یہ پل کی پل میں کیا طِلسمات کا کھیل ہُوا۔ وہی دامنِ کوہ، وہی گاگر مگر لڑکی بدل گئی۔ لو نیا گُل کھِلا۔ گاگر میں اور پانی میں باتیں ہونے لگیں۔
چشمے کا پانی:۔ کب سے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ دیر سے بلا رہے ہیں کہ تم آؤ اور ہم تمہاری گود میں شہر کے گھروں کی سیر کر آئیں۔ لو آؤ۔ اُٹھا بھی لو۔ ہم اور تم مل کر گائیں گے۔
گاگر:۔ مجھے تمہارے بغیر کب چین آتا ہے۔ آؤ شوق سے مگر ذرا میں بھی تو نہا لوں۔

کیا خوب! پھر سین بدلا۔ پھر وہی اصلی لڑکی ہے۔ گاگر کو مانجھ رہی ہے۔ گاگر خوب جھمجھانے لگی۔ چشمے کا پانی تالیاں بجانے لگا کہ آپا آئیں آپا آئیں۔ چلوں اب اس لڑکی سے پوچھوں کہ مَیں کیا ہوں؟
مَیں:۔ کیوں بُوا؟ میں کیا ہوں؟
لڑکی:۔ کانوں میں اُنگلیاں دے بیجئے تب میں بتاؤں۔
اس لڑکی کی پانی کی۔ ہوا کی آواز اس وقت ایک ہے! میرے جسمانی کان بند ہو گئے۔ آنکھیں بھی! مَیں مَیں نہیں ہوں اور یہ سُن رہا ہوں:۔
پانی۔ ہوا۔ لڑکی۔ پھُول۔ تنکے۔ (یک زباں ہو کر):۔ آپ دیوتا ہیں۔ بلکہ اِس سے بھی بالاتر۔ آپ کچھُ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمتر۔ انحصار صرف اس بات پر ہے کہ آپ کی نیت کیا ہے۔ اے عزیز اپنا دھوبی آپ بن اور دل کو دھو ڈال۔ قلی بن اور نیکی کی گٹھڑی اُٹھا۔ خود پسندی چھوڑ

جگ پسند بن۔ سمجھ سمجھ! خدمت کو ایمان۔ ایمان کو جان"!!

بات تو صرف اِتنی تھی کہ میں گزر رہا تھا اور میں نے معمولی طور پر ایک بھری گاگر کو سر پر دھروانے میں مدد دی۔ اس ایک ثانئے میں اِتنا ڈراما کِس طرح ہو گیا؟ مگر میں نے حقیقتاً سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سُنا۔ اور سب کچھ ہُو لکھ

مَیں بعض دفعہ آناً فاناً کِس طرح بدل جاتا ہوں۔ کیا میری بیداری غفلت ہے اور میرے یہ کبھی کبھی آنے والے خواب حقیقی بیداری؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا ہوں؟

عبد العزیز

یہ تم سے نہ ہو گا

نہیں! کلیوں کو شگفتہ کرنا، یہ تم سے نہ ہو گا!

کلی کو ہلاؤ، اُسے جھٹک دو لیکن یہ تمہارے بس میں نہیں کہ اُسے شگفتہ کر سکو۔ تمہارا مَس اُسے خراب کر دیتا ہے تم اُس کی پنکھڑیوں کو پاش پاش کر دیتے ہو اور پھر اُنہیں خاک پر منتشر کر دیتے ہو لیکن نہ اُس میں رنگ آتا ہے اور نہ خوشبو پیدا ہوتی ہے۔

آہ! کلیوں کو شگفتہ کر دینا، یہ تم سے کبھی نہ ہو گا!

وہ جو کلی کو کِھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کھلاتا ہے۔ وہ صرف اُسے اک نظر دیکھتا ہے اور خونِ حیات اُس کلی کی رگوں میں دوڑ جاتا ہے۔ اُس کے نَفَس پر پھُول اپنے پر پھیلا دیتا ہے ورہوا میں پھڑ پھڑاتا ہے۔ رنگ دل کی اُمنگوں کی طرح اُس میں بھر جاتے ہیں اور خوشبو اک شیریں سا راز آشکار کر دیتی ہے۔

وہ جو کلی کو کِھلا سکتا ہے کس سادگی کے ساتھ اُسے کِھلاتا ہے!

(ماخوذ) بشیر احمد

بزمِ تحقیق

اِس عنوان کو بھی ہم مستقل کرنا چاہتے ہیں اس کے ذیل میں اُردو زبان کے متعلق تحقیق طلب سوال اور اُن کے محققانہ جواب درج ہُوا کرینگے۔ کسی خاص مسئلہ زبان پر مشاہیرِ اہلِ زبان کے خیالات باہمی اختلافات پھر اُن پر محاکے شایع ہوں گے۔ ذیل میں اُردو زبان کے اہلِ الرائے کی توجہ منعطف کرنے کی غرض سے چند سوالات درج کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ماہرینِ زبان اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمائیں گے!

(۱)۔ اُردو زبان کو ہندوستان کی مشترکہ مُلکی زبان قرار دینے کے لئے اسکو وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہر قسم کے خیالات۔ مضامین۔ دقیق سے دقیق علمی مسئلے اس کے ذریعہ سے بطورِ احسن بیان کئے جاسکیں، دوسری علمی زبانوں کے ترجمے اس شان سے اُردو میں ہوں کہ اصل زبان کا زورِ کلام، فصاحت و بلاغت، لُطفِ ادا ظاہر ہونے کے ساتھ ہی اردو بھی اپنی صفات سے اجنبی ہوجائے، اس مقصدِ اہم کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ

ا۔ اُردو مصادر کو وسعت دی جائے۔

ب۔ الفاظ کی صفاتِ مقررہ کی حدود وسیع کی جائیں۔

ج۔ تشبیہات کو طویل الذیل بنایا جائے۔

د۔ اُردو گرامر کی محدود چار دیواری کو منہدم کرکے حدِ نظر تک محیط قلعہ تعمیر کیا جائے۔

ہ۔ دِلّی اور لکھنؤ کی بیجا بندشوں سے اُردو کو آزاد کرکے لامرکزیت کے اصول رائج کئے جائیں۔

و۔ اُردو نظم کو معیّنہ بحور و اوزان میں محدود رکھنے کی بجائے بلینک ورس اور اسی قسم کی نثر نما نظموں کو رواج دیا جائے۔

(۲) (ا)۔ اُردو گرامر کی رُو سے غیر فارسی و غیر عربی لفظ کی اضافت فارسی و عربی لفظ کی طرف نہیں ہوسکتی اسی طرح اس کے برعکس اس مسئلہ میں اِس قدر غلو سے کام لیا جاتا ہے کہ وہ عربی و فارسی الفاظ جن کے ہندی استعمال میں ذرا سا اختلافِ حرکت و لہجہ پیدا ہونے کی وجہ سے انہیں مُہنّد کا خطاب دیا جاتا ہے اُن کی اضافت بھی جائز نہیں مثلاً لفظ مُوسِم بکسرۂ سین عرب نژاد ہے۔

"صادف موسم الخیف مهمان الضیف"

اُردو میں "موسَم" بفتح سین استعمال ہونے کی وجہ سے یہ مُہنّد ہوگیا ہے اور اس کی اضافت بصورتِ مُہنّد جائز نہیں چنانچہ مرہمِ گل کا قافیہ اگر موسمِ گل باندھا جائے تو غلط سمجھا جاتا ہے کیونکہ اضافت کی حالت میں موسِم مُوہِم کا ہمقافیہ ہوگا نہ کہ مرہم کا۔

(ب)۔ وہ اسم صفت جو کسی اسم و امر کی ترکیب سے بنایا جاتا ہے جیسے دل دار۔ دُور بیں۔ اس کے متعلق بھی یہی حکم ناطق ہے کہ اس مرکب میں امر کے ساتھ جو اسم ہو عربی یا فارسی ہونا ضروری ہے۔ ضرورت

ہے کہ ان سختیوں کو کسی اصول کے ماتحت کم کیا جائے۔ سوال کے دونوں پہلوؤں پر غور کی بہت گنجائش ہے۔

حصۂ (الف) میں سائل کے منشا کی تائید

"لبِ سڑک"، "مزدور پارٹی"، "آبِ رواں"، "لیگِ اقوام"، "ایڈیٹر زمیندار" وغیرہ الفاظ کرتے ہیں۔

یہ الفاظ روزمرہ میں داخل ہو کر فصحا کی زبانِ قلم و دہن پر بھی قابض ہو چکے ہیں۔ سامعہ کو حکم بنا کر ایسے بہت سے مرکب تراشے جا سکتے ہیں جنہیں کثرتِ استعمال کچھ دنوں میں فصیح بنا کر اُردو لغات میں معتدبہا اضافہ کرے گی۔

حِصۂ (ب) - پر عملدرآمد کی سفارش الفاظِ ذیل کا استعمال کر رہا ہے۔

سمجھ دار۔ لچھّے دار۔ لٹّو دار۔ گاڑیبان وغیرہ

(۳)۔ سنسنی خیز۔ رہائش۔ فوق البھڑک۔ ہر سہ الفاظ بالا کو کثرتِ استعمال نے قبولیت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زبان سے بولنے والے اِن سے دلوں کو بھی صاف کر لیں۔

(۴) - لفظ صحیح بروزنِ فعیل ہندوستان کی علمی دُنیا میں بھی اب صرف زبانِ قلم پر باقی رہ گیا ہے۔ بولنے والی زبان اس سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ اُن مٹھی بھر مذہبی علما کو چھوڑ کر جو اپنے روزمرّہ میں حرفِ حلقی کو حجازی لہجہ میں ادا کرتے ہیں فصحائے اُردو میں سے غالباً کوئی متنفس بھی "صحیح" کو فعیل کے وزن پر نہیں ادا کرتا بلکہ صحی بوزن نفی استعمال ہوتا ہے تو کیا اردو کو مستقبل کی عام ملکی زبان بنانے کی غرض سے اس قسم کے الفاظ کی کتابت کو مروجہ تلفظ کے مطابق بنایا جا سکتا ہے؟

میں چاہتا ہوں کہ ان معروضات پر وسیع الخیالی کو پیشِ نظر رکھ کر اہلِ ادب غور فرمائیں۔

جوابات مختصر۔ مدلّل۔ متین ہوں اور تحریر سے مکابرہ کی شان نہ پیدا ہوتی ہو۔

حضراتِ ذیل سے خاص طور پر توجہ فرمائی کی درخواست ہے:-

علّامہ طباطبائی لکھنوی۔ مولانا شوق قدوائی لکھنوی۔

مولانا شاداں لکھنوی۔

حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی۔

لالہ سری رام ایم اے مولف خمخانۂ جاوید۔

مولانا وحید الدین سلیم (عثمانیہ یونیورسٹی)

مولانا عبد الحق بی اے۔ (انجمن ترقی اردو)

پنڈت برج نرائن چکبست مدیر صبح امید۔

حضرتِ بیخود دہلوی۔

تاجور

نسوانی دُنیا

مِس اینی کینن دُنیا کے قابل ترین ہیئت دانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ وہ آلہ کے ذریعے ایک نظر میں تاروں کے فاصلے کا اندازہ کرلیتی ہے۔ عنقریب وہ ایک فہرستِ انجم شایع کرنے والی ہے جس میں اُس نے سات لاکھ ستاروں کا درجہ بدرجہ ذکر کیا ہے۔

امسال چیرنگ کراس (لندن) کے طبی مدرسے میں سترہ انعامات میں سے بارہ انعام عورتوں نے حاصل کئے اور صرف پانچ مردوں نے۔ ڈاکٹر فیئن نے جلسۂ تقسیم انعامات میں تقریر کرتے ہُوئے بیان کیا "کہ یہاں سب مردوں عورتوں کو برابری کے درجے پر رکھا جاتا ہے" اور کہا کہ "فہرستِ انعامات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ مردانہ فوقیت پر پھُولے نہیں سماتے وہ کس قدر گمراہ اور حقیقت سے بعید پڑے ہیں"

امریکہ میں تیس شہروں میں پولیس کے محکمے میں عورتیں موجود ہیں۔ نیویارک میں ایک پولیس کی چوکی میں صرف عورتیں ہی ہیں مرد کوئی نہیں۔ انگلستان میں بھی اس وقت پندرہ سو عورتیں پولیس کا کام سیکھ رہی ہیں اور وائی کونٹ ایسٹر کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف ایک تجربہ نہیں بلکہ عورتوں کی قابلیت کا عملی طور پر ثبوت مل چکا ہے۔

حکومتِ انگلستان نے فیصلہ کیا ہے کہ برطانیہ کی حدود کے اندر سول سروس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی داخلہ کا حق عطا کیا جائے لیکن عورتوں کی تنخواہ کم ہو گی۔ (ب ل)

معاصر العراق (بغداد) خبر دیتا ہے کہ بغداد میں ملک فیصل کے حکم سے وزیر تعلیم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد رکھنے والے ہیں۔ دُور دُور سے معلمات بُلائی گئی ہیں۔ العراق (بغداد)

تاجور

یادِ ایّام

ایڈمنڈ برک (پیدائش ۱۷۳۰ء وفات ۱۷۹۷ء) برک انگلستان کا ایک مشہور سیاست دان اور فصیح البیان مقرر تھا۔ وہ ہر موقع پر آزادی کا حامی اور استبداد کا سخت مخالف تھا۔ یہی شخص تھا جس نے ہند کے پہلے گورنر جنرل کے خلاف اُس کے مظالم کے متعلق برطانوی پارلیمنٹ میں ایک طول طویل تقریر کی۔ ۱۷۸۴ء میں ضلع بکنگھم کے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہُوئے اُس نے کہا کہ "لوگ کبھی اپنی آزادی کو نہیں کھوتے جب تک وہ کسی دھوکے کے اندر نہ آجائیں"۔ ایک اور موقع پر اصلاحِ اقتصادی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہُوئے اُس نے سرکاری اخراجات کے متعلق مطالبۂ شاہی کے جواب میں کہا کہ "رعایا مُفلس ہے"۔ دو سال بعد جب جارج سوم نے دار العوام کو کفایت شعاری کا پیغام بھیجا تو برک نے کہا کہ "یہ بہترین رعایا کے لئے بہترین بادشاہ کی طرف سے بہترین پیغام ہے"۔

(ب)

حضرت امیر معاویہؓ نے ایک دن نہایت فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا۔ اپنے خطبہ کی فصاحت انہیں خود بھی پسند آئی۔ آپ نے مفتخرانہ لہجہ میں لوگوں سے دریافت کیا کہ تم میں سے کسی کو میرے خطبہ میں کوئی عیب تو نظر نہیں آتا؟ سامعین میں سے ایک شخص بولا کہ "ہاں اس خطبہ میں اک بہت بڑا عیب نظر آتا ہے"۔ امیر معاویہؓ نے پوچھا وہ کونسا عیب ہے؟ اس نے کہا یہی کہ تم نے اپنی ذات پر فخر کرتے ہُوئے اپنے خطبہ کی تعریف کی۔

(الہلال مصر)

ایک شخص نے حکیم سقراط کو اس کی مجہولیتِ نسب پر عار دلاتے ہُوئے اپنے آبائی شرف کی تعریف کی سقراط نے جواب دیا کہ:-

"تجھ پر آکر تیرا خاندانی شرف ختم ہو جاتا ہے۔ اور مجھ سے میرا قومی عروج شروع ہوتا ہے۔ پس میں اپنی قوم کے لئے سرمایۂ ناز ہوں اور تو اپنے خاندان کے حق میں باعثِ ننگ ہے"۔

(الہلال مصر)

(تاجور)

لغات الجاہلین

آدم۔ ڈارون کی گم شدہ کڑی، ڈارون کا ایک بزرگ جس سے وہ منکر تھا۔ (د ب)

ایڈیٹر۔ وہ "ہم" جس سے متکلم ساری دنیا مراد لیتا ہے۔

وہ نمایندہ۔ جس کی ہستی سے اُن لوگوں میں سے کوئی بھی واقف نہیں جنکی یہ نمائندگی کا ادعا رکھتا ہے۔

وہ بیکار پڑھا لکھا۔ جو دنیا کے تمام تجربوں میں ناکام ہو چکا ہے۔

وہ عجیب الخلقت انسان۔ جو اکثر حالات میں اپنے اخبار یا رسالہ کا مینیجر بھی ہے۔ کلرک بھی ہے۔ چپراسی بھی۔ کسی دفتر کا ملازم بھی۔ اور پھر اڈیٹر بھی۔ اور یورپ کا وہ خوش قسمت سیاست دان بھی۔ جس کی ایک جنبش قلم نظمِ سلطنت میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ (تاجور)

بھائی۔ ایک شخص جو تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری تمام کمزوریوں سے واقف ہو چکا ہے اور تمہیں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک شخص جو تمہارے دوستوں کی بیوقوفی پر ہنستا ہے۔ (د ب)

بیرسٹر۔ (یا وکیل) ایک قوم جو لوٹ مار پر گذارہ کرتی ہے۔ ایک پُر منطق جھگڑالو جو کچہری کے اڈے میں کرائے پر ملتا ہے۔ اور جس کا کام کبھی جھوٹ کو سچ اور کبھی سچ کو جھوٹ ثابت کر دکھانا ہے۔ لفظِ بیرسٹر بیرا اور سٹہ اور رائے مہملہ سے مرکب ہے۔ لوگوں کے بیرا اور سٹہ بازی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی مہمل رائے پیش کرنے والا شخص۔ ایک مُنہ پھٹ صاف گو آدمی جس سے حکومت اور رعایا دونوں ناخوش ہیں۔ (د ب)

وہ فاقہ مست جنٹلمین جو بینکوں کے رحم پر زندگی گذارتا ہے۔ جس کی جائداد۔ گاڑی۔ گھر اور اس کا سامان، سب قرضخواہوں کی نگرانی میں رہتا ہے۔ جو براہ راست فیس کے متعلق کسی موکل سے گفتگو کرنا اپنی توہین سمجھے لیکن دلال کے ذریعہ سے (جس کی آمدنی بیرسٹر صاحب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے) دو روپے فی پیشی پر راضی ہو جائے جو کسی دعوے کے متعلق یہ یقین کرتے ہوئے بھی کہ یہ پہلی ہی پیشی میں ڈسمس ہو جائیگا۔ موکل کو اس کی کامیابی باور کرانے میں فصاحت کے دریا بہا دے۔ (تاجور)

تقدیر۔ نکھٹوؤں کا بہانہ۔ قوانینِ قدرت جو انسان کی فہم سے بالاتر ہیں۔ تدبیر نہ چل سکنے کا نام۔ جو کچھ انسان کی مرضی کے خلاف ہو۔ مسلمانوں کا ایک عذر خواہ اصول۔ خدا پر الزام دھرنا۔ (د ب)

جنٹلمین۔ نمائش کا عاشقِ زار۔ قرض کا ٹھیکہ دار۔ باتیں کرنے والا حیوان۔ سب کچھ جان بوجھ کر نادان۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے والا الفرقِ امین کا محسن، مجسم دیوالا۔ دوکانداروں کا دوست۔ اپنا دشمن سیٹی بجا کر چلنے والا انجن۔ اچھی خاصی نظر کے باوجود عینک لگانے کا شوقین اپنا، اور دوسروں کا وقت ضایع کرنے کی مشین۔ "تھینک یو" اور "آئی بیگ یور پارڈن" کے دوروں میں بتلا۔ ان پڑھی کتابوں کو خوبصورت الماریوں میں سجانے کا شیدا۔ وہ کانچ کا بنا ہُوا ہیرو جس کی قبر پر یہ کتبہ لکھا جاتا ہے:۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا (ا۔ش)

ایک قسم کا آدمی جو پتلون کوٹ اور واسکٹ، کالر ٹائی اور جُراب، انگوٹھی گھڑی اور عینک سے آراستہ ہو کر اپنی چھڑی سے اپنی ایڑی کو پیچھے کی طرف سے ٹھکراتا ہے۔ بات کرتے وقت آسمان کی طرف دیکھتا ہے کھاتے وقت اپنے ساتھی پر نگاہ رکھتا ہے اور ہنستے وقت اپنی ٹھوڑی سے اپنے کالر کو چھُولیتا ہے۔ "مردِ لطیف"، جس نے عورت کی ادائیں سیکھی ہوں۔ ایک حیوان جس کے گلے میں تہذیب نے اپنا پھندا ڈال دیا ہے۔ ایک "تمدن زدہ" ہندوستانی جس نے نقالوں سے تبدیلِ لباس کا فن سیکھا ہے۔ (د۔ب)

جو بڑی صفائی کے ساتھ ٹھنڈی سڑک کی دوکانوں سے رومال اور جُرابوں کی چوری کرے۔ (الطاف حسین)

دل لگی۔ (مشرقی) ایک دلبرِ موہوم کی یاد میں برسوں صحرائے وحشت کی خاک چھاننا۔

(مغربی) دو دن میں دس لڑکیوں کے ساتھ محبت قائم کرنا۔ (د۔ب)

پُرانے فیشن کے مولویوں سے مذہبی بحث کرنا۔ (اسد)

ڈاڑھی۔ بالوں کا ایک پریشان مجموعہ جو کششِ ثقل کے اقتضا سے نیچے کو لٹکتا ہے۔ بالوں کی بنی ہُوئی ایک شے جو سردیوں میں گلوبند اور گرمیوں میں پانی چھڑکنے سے خس کی ٹٹی کا کام دیتی ہے۔ چہرے کے لق و دق میدان سے متصل ایک گنجان مرغزار جہاں ایک گھسیارا ہر صبح گھاس کاٹتا ہے۔ کبھی کبھی گھاس کاٹتے وقت ایک خون کا چشمہ اُبل پڑتا ہے تو گھسیارا اُس پر سفید راکھ ڈال دیتا ہے۔ یہ گھاس جتنی کٹتی ہے اُتنی زیادہ بڑھتی ہے۔ (د۔ب)

مسجد میں سے جوتیاں چُرانے کی آڑ۔ خدا سے بھی بڑھ کر پردہ پوش۔ (محمد اسد خان۔ ملتان)

وہ مجرم جو نئی روشنی کے دربار میں گردن زدنی قرار پا چکا ہے۔ وہ مولویت کی سند جس کے ہوتے عربی اور دینیات کی تحصیل ضروری نہیں۔ وہ لچھے دار عزت جس کی جانب گستاخ ہاتھ سب سے پہلے بڑھتا ہے۔

(تاجور)

محفلِ ادب

یورپ کے علم وفن پر اسلام کا اثر

مسٹر ایچ اے سلمین سی۔ آئی۔ ایم پروفیسر عربی کنگس کالج لنڈن اپنی تصنیف "سلطنت عرب کا عروج و زوال" میں ایک جگہ علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اس مادہ میں نئی روح پھونکنے کا فخر صرف عربوں کو حاصل ہے۔ یہ عرب ہی تھے جنہوں نے گم شدہ یونانی مصنفوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اہل عرب نے علم کی وہ شمع روشن کی جس نے تاریخ کے سیاہ صفحوں کو جمکا دیا۔ اور یقیناً اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تاریخ اتنی شاندار نہ ہوتی"۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ قوموں کی علمی ترقی بجائے تصنیفات کے تراجم و تالیفات سے شروع ہوتی ہے اور عرب کے فضلا اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ترجموں کی بدولت سنسکرت اور یونانی مصنّفوں کو جن کو دنیا بھول جانے والی تھی زندۂ جاوید بنایا اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ یونانی فلسفہ کو ترقی دی۔ جبر و مقابلہ۔ علم ہیأۃ۔ علم نباتات وغیرہ کو ایجاد کیا اور انتہائی درجہ تک پہنچایا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۶) نے اقرار کیا ہے کہ الخوارزمی کی تصنیفات نے یورپ والوں کے لئے جو الجبرے کے نکات حل کرنا چاہتے تھے رہبر کا کام دیا۔ موجودہ علم کیمیا ابو موسےٰ جعفر کوفی کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے"۔ (عبرت)

ہندوستان اور چین کا سیاسی رفارم

اس عنوان کے تحت میں معاصر "صوفی" نے صدر جمہوریۂ چین کی سیاساتِ حاضرہ پر ایک تصنیف کا دلچسپ اقتباس درج کیا ہے سطور ذیل اُسی روشنی کا عکس ہیں۔

"ہم لوگ چین میں اپنی گورنمنٹ کو موجودہ تہذیب کے معیار پر لانا چاہتے ہیں اور قریب قریب یہی حال ہندوستان کا ہے جہاں کی پر جوش نوجوان جماعت حکومت و نظام حکومت کے لئے مغربی معیار کو پیش نظر رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایک اصولی غلطی ہے کیونکہ قومیت کا سیاسیات و نظامِ حکومت کا اختلاف ہے۔ اور مشرق میں وہی حکومت باعثِ امن وخیر ہو سکتی ہے جو مشرقی تہذیب کی حامی ہو۔ جس طرح مغرب کی حکومت مغرب تہذیب کے دوش بدوش ترقی کر سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ جو ملک ترقی کرنا چاہتا ہے وہ اپنی ہی زمین کے تجربات و مشاہدات، اپنی ہی قوم کے دیرینہ روایاتِ اخلاق و تہذیب پر حکومت کی بنیاد

قایم کرے۔ ورنہ حقیقتاً اختلافِ مذاق اک ایسا اختلاف ہے کہ باوجود تمام کوششوں کے اُن میں تصادم ہو جانا ضروری ہے"۔

(صوفی)

مرنے کے بعد

ذیل میں مشہور ہندی شاعر ہریش چندر کی اک دلگداز ہندی نظم کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

مرنے والے کا چہرہ وہی ہے جسے زندگی میں چاند کا لقب دیا جاتا تھا۔

وہی بازو ہیں جن سے بہادری کے بڑے بڑے کارنامے ظاہر ہوئے۔ آہ! وہی پاؤں ہیں جن پر بہت سی پیشانیاں جُھک جاتی تھیں۔ وہی سڈول جسم وہی سحر کار زبان جس کی شیرینیٔ گفتار امرت کا کام دیتی تھی وہی ہاں وہی دل و دماغ ہے جس میں عالی جذبات اور بلند ترین خیالات جگمگا رہے تھے۔ سب چیزیں وہی ہیں۔ صرف اک جان کی گم شدگی سے وہی پیارا جسم زمین پر پڑا ہوا ہے۔ آہ زندگی میں جس کو سب پیار کرتے تھے جو سب کے دل لبھاتا تھا صرف ایک جان کے نہ ہونے سے اسے سب دہکتی ہوئی آگ میں جلانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اُف جن کی نزاکت پھول کے بوجھ کی بھی متحمل نہ تھی جنہیں دردِ سر کی بھی سہار نہ تھی آج ان کے جسم پر بھاری بھاری لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ انکے سروں کی کپال کریا ہو رہی ہے۔ جنہوں نے اپنے عزیز و اقربا کو کبھی نہ چھوڑا تھا آج سب انہیں چھوڑے جاتے ہیں۔ آہ وہ آنکھیں چیل کوؤں کی غذا بن رہی ہیں جن کی جنبشِ التفات کبھی بڑے بڑے راجاؤں کی اُمیدوں کا مرکز تھی۔ جو اپنی بہادری اور فتوحات کی وجہ سے ساری دُنیا میں بھی نہیں سما سکتے تھے آج دو گز کفن میں مُنہ چھپائے پڑے ہیں۔ اب راجا اور پرجا کا کوئی فرق نہیں رہا وقت نے سب کو ایک ہی نظر سے دیکھا۔ اِس وقت خوبصورت و بدصورت۔ امرت اور زہر۔ ایک ہی قیمت رکھتے ہیں راجہ پرو اور راجہ دد ہیچ موت نے کسی کا نشان نہیں چھوڑا۔

صرف کتابوں میں نام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(ستیہ ہریش چندر)

قومیت کیا ہے؟

ہم نے ممالک غیر کے اخبارات وادبی رسایل منگائے ہیں اُمید ہے کہ آیندہ نمبروں سے عراق عرب مصر۔ و ایران کے جراید کا بہترین انتخاب زینت افروزِ ہمایوں ہوا کریگا۔ گاہے ماہے مرہٹی، ہندی، اور بنگالی کی ادبی کانوں کے درخشاں جواہر بھی نظر نوازی کیا کرینگے۔

معاصر الہلال (مصر) نے اپنے تازہ ترین نمبر میں قومیت کیا ہے؟ کے عنوان سے ایک جاذبِ نظر مقالہ شایع کیا ہے۔ محفلِ ادب کی تنگ دامانی کو اس کی تمام فراوانیوں کے لئے ناکافی دیکھ کر اس کا مختصر اقتباس

ہدیۂ التفات کرتے ہیں +

"افرادِ انسانی کے ہر مجموعہ کو گروہ اور قوم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ قومیت کا اعتبار افراد سے نہیں بلکہ اُن رابطوں سے ہوتا ہے جو افراد کو باہم منضبط کرتے ہیں۔ اور حقیقتاً انہیں روابط سے افراد میں روحِ قومیت پیدا ہوتی ہے۔ ان ہی کے قوت وضعف سے کوئی قوم ترقی یافتہ وتنزل پذیر کہلاتی ہے یہ رابطے گویا شعورِ قومی ہیں۔ قومیت اس شعورِ قومی کے سوا ہیچ ہے۔ یہ شعور افراد میں یگانگت پیدا کر کے ان میں یہ سمجھنے کا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہیں جس کی زندگی باہم مشترک ہے۔ اس حیاتِ مشترکہ کی حفاظت پر وہ جان ومال قربان کر دینے میں مضایقہ نہیں سمجھتے۔ پھر یہ رابطہ یا شعورِ قومی جن اسباب سے پیدا ہوتا ہے جن امور کے وجود پر اس رابطہ کا ظہور موقوف ہے ان میں سب سے اہم ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱)۔اتحادِ جغرافی (۲) اتحادِ جنسی (۳) اتحادِ لسانی (۴) اتحادِ مذہبی (۵) اتحادِ تاریخی ..... الخ

ہندوستانیوں کی اہم ضروریات مسٹر کے۔ایل۔ رلیارام ہماری اہم مُلکی ضروریات بیان کرتے ہُوئے سب سے پہلے اشاعتِ تعلیم پر زور دیتے ہیں:۔

آج ہندوستان میں چار دیہات میں سے صرف ایک گاؤں میں اسکول ہے اور تیس کروڑ بچے جنہیں اوائلِ عمر میں تعلیم ملنی چاہیئے ان پڑھ رہتے ہیں + ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق اکتیس کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانیوں میں سے صرف ایک کروڑ پچاسی لاکھ اشخاص جن میں ایک کروڑ اُنہتر لاکھ مرد اور سولہ لاکھ عورتیں تھیں پڑھے ہُوئے تھے جس سے ۸ء۵ فی صدی کی تعلیمی اوسط نکلتی ہے + اس کے مقابل میں جاپان کی اوسط ۹۵ فی صدی برطانیہ کی ۹۴ فی صدی اضلاعِ متحدہ (امریکہ) کی ۹۰ فی صدی ہے + برطانوی ہند میں ابتدائی تعلیم کے ۱،۴۲،۲۰۳ اسکول ہیں جن میں ۵،۸۱۸،۷۳۰ طلبا پڑھتے ہیں۔ ان میں ۵،۱۸۸،۴۱۱ لڑکے اور ۶،۳۰،۳۱۹ لڑکیاں ہیں + اگر ہم ہر قسم کی درس گاہیں شمار کریں تو آبادی کے ہر ۱۷۱ اشخاص کے حصّے میں صرف ایک درس گاہ آتی ہے + زیادہ ترقی یافتہ مُلکوں میں اسکول میں پڑھنے والے اشخاص آبادی میں ۱۵ سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ہیں + صنعتی تعلیم کا حال تو نہایت افسوسناک ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں سارے مُلک میں صرف ۱۶،۵۹۴ اشخاص صنعت وحرفت کی تعلیم پا رہے تھے + اسی تعلیمی کمی کی وجہ ہے کہ اخباروں رسالوں کی مانگ مُلک میں کم ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں صرف ۳۹۷۸ اخبارات ورسائل تھے + ہندوستان میں دس لاکھ اشخاص کے حصّے میں ان کی اوسط ۱۲ برطانیہ میں ۱۹۰ جاپان میں ۵۰ اور اضلاعِ مُتحدہ میں ۲۲۵ ہے +

مُلک کی دوسری بڑی ضرورت زراعت کی ترقی ہے +

موجودہ ہندوستان کے لئے یہ امر باعثِ ننگ ہے کہ حالانکہ اُس کی آبادی کے تین چوتھائی حصے کا صرف زراعت پر گذران ہے لیکن تاحال اس کام کے لئے دُنیا کے جدید تریں ایجادات کو مُلک میں رائج نہیں کیا۔ بلکہ اُنہیں دقیانوسی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں +

صحتِ عامہ کی بہتری ایک اَور ضروری چیز ہے +

یہ امر مُسلّمہ ہے کہ شہروں اور قصبوں میں حفظانِ صحت کا انتظام شرمناک ہے + پچھلے دس سالوں کی شرحِ موت کی اوسط ۸ء ۳۱ رہی ہے اِس مدت میں جاپان کی اوسط ۹ء ۲۱ کینیڈا کی ۵ء ۱۲ برطانیہ کی ۶ء ۱۴۔ اضلاعِ متحدہ کی ۰ء ۱۴ اور آسٹریلیا کی صرف ۵ء ۱۰ ہے + یہ بات دلچسپی کا موجب ہو گی کہ ایک ہندوستانی کی اوسطِ عُمر ۲۳ برس ہے جب کہ مغرِبی مُلکوں میں یہ اوسط ۴۵ سے لے کر ۵۵ تک پہنچ جاتی ہے +

(ینگ مین آف انڈیا)

شذرات

عام طور پر ادبی رسالے ناقدری کے ہاتھوں نالاں رہتے ہیں۔ ادبیات کی کساد بازاری کے افسانے اس درجہ حوصلہ سوز ہو چکے ہیں کہ کسی نئے کام کرنے والے کو اس میدان میں قدم رکھتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس تصویر کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ "ہمایُوں" کو شائع ہُوئے ابھی بیس روز نہیں ہُوئے اور اس وقت خریداروں کے رجسٹر میں آخری خریداری نمبر چھ سو اکتیس ۶۳۱ تک پہنچ چکا ہے جن میں سے دو سو تینتیس صرف لاہور میں خریدار ہوگئے۔ آثار ترقی کو دیکھتے ہُوئے مجھے یقین تو نہیں البتہ ظنی اعتماد ہے کہ چھٹے ساتویں نمبر تک ہمایُوں کی بارہ پندرہ سو تک اشاعت ہو جائیگی۔ پہلی ہی اشاعت میں چھ سو اکتیس ۶۳۱ خریداروں کا بہم پہنچ جانا قابلِ رشک ضرور ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئیے کہ آمد و خرچ میں یکسانیت کا کوئی امکان پیدا ہو گیا ہے۔ بارہ سو کی اشاعت تک رسالہ نقصان ہی پر چلتا رہیگا + **قاعدۂ خدمت زندہ باد**

بہت سے گرامی قدر معاونین کا عموماً اور خان عبدالرحیم صاحب بار ایٹ لا ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ سید علی منظر صاحب بار ایٹ لا (پٹنہ) ڈاکٹر حسن سہروردی پی ایچ ڈی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ (بنگال) سید محمد سلیم بی اے بار ایٹ لا۔ ڈاکٹر ولی محمد صاحب پی ایچ ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔ شیخ نور احمد صاحب بار ایٹ لا (دہلی)۔ ایم عبدالمجید صاحب اختر بی اے۔ میاں محمد اسلم صاحب منصف (الہٰو) کا خصوصاً شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ ان حضرات نے بلا تحریک "ہمایُوں" کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا اول الذکر محترم نے پچاس کے قریب اور ثانی الذکر کرم نے بیس خریدار عنایت فرمائے۔

جنوری کے "ہمایُوں" میں فروری نمبر کے اہل قلم کی فہرست دیگئی تھی۔ ان میں سے اکثر حضرات کے مضامین موصول ہو چکے تھے اور کچھ مضامین آنیوالے تھے اسلئے اس امر کا اندازہ کئے بغیر کہ مندرجۂ فہرست اہل قلم کے مضامین ایک نمبر میں سما بھی سکینگے۔ فہرست شائع کر دی گئی۔ فروری نمبر کو ترتیب دیتے وقت یہ تجربہ بھی ہوا کہ مستقبل کے لئے کوئی وعدہ بے سوچے سمجھے نہیں کرنا چاہیئے۔ مندرجہ بالا فہرست اہل قلم کے مضامین دو رسالوں میں بھی مشکل سے سما سکینگے"

مشاہیرِ اہلِ قلم کی گرانقدر توجہ کا ہم شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انکی بیکراں توجہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج جنوری کی ۲۴ تاریخ ہے اور ہم جون تک کے رسالے ترتیب دے چکے ہیں +

"بزمِ تحقیق" کے متعلق جو حضرات کچھ تحریر فرمائیں اُن سے مودبانہ درخواست ہے کہ حد سے زیادہ اختصار سے کام لیں کیونکہ دوسرے مضامین کی کثرت نے "بزمِ تحقیق" کو "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" کا حکم سُنا دیا ہے +

(تاجور)

حصۂ نظم

کلامِ اکبر

سکوں ہوتا نہیں دل کو مرادیں بر نہیں آتیں — یہ آہیں عرش تک جاتی تو ہیں کچھ کر نہیں آتیں
شبِ غم کو بسر کر صبحِ راحت کی امیدوں میں — بلاؤں سے نہ ڈر۔ خاموش رہ۔ کیس بر نہیں آتیں
ہماری گردنیں تو صرف مسجد ہی میں جھکتی ہیں — مگر دیکھیں کہ یہ کب تک تہِ خنجر نہیں آتیں

(غیر مطبوعہ)

رباعیاتِ گرامی

ذیل میں مولانا گرامی کی چند روح فروز رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رباعیاتِ گرامی کے بالمقابل سحابی نجفی۔ عمرِ خیام۔ ابو سعید۔ سرمد۔ جامی کی ہم مضمون رباعیاں شائع کر کے ان پر محاکمہ کی خدمت نقادانِ سخن کی رائے کے سپرد کر دیں مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ہم اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے کیونکہ ابو سعید کی رباعیات (مرتبہ پروفیسر کشوری موہن صاحب متر ایم اے) زیرِ طبع ہیں اور سرمد کی رباعیاں دستیاب نہیں ہوئیں۔ امید ہے کہ آئندہ نمبر میں ہماری جستجو مکمل طور پر کامیاب ہو جائے گی۔ (تاجور)

برعرشِ بخویشتن در ستیز آمدہ ایم — آخر بزمینِ فتنہ خیز آمدہ ایم
برما تمسیانِ آرزو حرف مگیر — ما گریہ کناں و سجدہ ریز آمدہ ایم

ازکنگرِ لامکاں بزیر آمدہ ایم — در دامگہِ بلا اسیر آمدہ ایم
ہاں اے اجل! اندازِ تغافل تا چند — کز سیرِ نظر فریب سیر آمدہ ایم

ما دلشدگان زلامکاں آمدہ ایم — از کشورِ جاں بخاکداں آمدہ ایم
اے مرگ! یکے زآستین دست برآر — در پنجرۂ جسم بجاں آمدہ ایم

پیامِ اُمید

نغمۂ دیر و حرم بھر دے ہیں اک تار میں — اور پرو دے دانۂ تسبیح کو زنّار میں

فتنۂ شیخ و برہمن سے بہت بالا ہو تو ‌ ‌ ‌ چھوڑ کر پستی کو اوپر دیکھنے والا ہو تو
مثل نقدِ جاں ہو تو جیبِ زبانِ ہند میں ‌ ‌ ‌ اک درخشاں لعل ہو۔ تاریک کانِ ہند میں
آبِ گنگا کی روانی ہو تری تقریر میں ‌ ‌ ‌ اور ہمالہ کی بلندی معنئِ تحریر میں
مُلک کی تاریک شب میں صورتِ مہتاب ہو ‌ ‌ ‌ یعنی جسمِ قوم میں اک دیدۂ بے خواب ہو
شامِ غم میں دیکھنا چاہے جو صبحِ عید کو ‌ ‌ ‌ خونِ دل سے سینچ اپنے گلشنِ اُمید کو
نخل کی ہر ایک رگ آبِ بقا سے سیر ہے ‌ ‌ ‌ پھول ہیں نکلے ہُوئے پھل میں ذرا سی دیر ہے
باغ کا ہر برگ اور ہر پھول ہو گا ہوشیار ‌ ‌ ‌ دیدۂ نرگس سے اُڑ جائینگے آثارِ خمار
داغ ہر لالے کا سینے پر سپر ہو جائے گا ‌ ‌ ‌ قصّہ تاراجِ خزاں کا مختصر ہو جائے گا
ہو نہ کچھ نقشِ تعصّب تیری رُوحِ پاک پر ‌ ‌ ‌ برق بن کر گر من و تو کے خس و خاشاک پر
رہنمائی کے لئے مشعل بنا سینے کا داغ ‌ ‌ ‌ اہلِ دل روشن کریں اس آگ سے اپنے چراغ
تو فنا فی القوم کے ساغر سے لذت گیر ہو ‌ ‌ ‌ تیرے ہر انداز میں اِک جادوئے تسخیر ہو
باغباں ہیں برقِ فطرت۔ اپنے گلشن میں بہت ‌ ‌ ‌ خضر کے انداز اب پیدا ہیں۔ رہزن میں بہت
پر ترا دل بادۂ ایثار سے سرشار ہو ‌ ‌ ‌ سوز سے بھرپور سازِ روح کا ہر تار ہو
جل گئے گو ظلم کی آتش سے پروانے کے پر ‌ ‌ ‌ شمع کے بھی پھول ہو جائیں گے تا وقتِ سحر
رنگ لائے گا طلسمِ نازِ قاتل ٹوٹ کر ‌ ‌ ‌ گر پڑے گی خاک پر زنجیرِ باطل ٹوٹ کر
ہو کے دانا امتیازِ زیور و زنجیر میں ‌ ‌ ‌ پھنس نہیں سکتا ہے پھر ہرگز کوئی تزویر میں

(خلیفہ عبدالحکیم ایم اے)

لذتِ عرفان

(۱)

رنگِ فطرت ہے وجہِ حیرانی ‌ ‌ ‌ عقل ہے وقفِ شرمِ نادانی
گلِ ظرفِ قفس نہیں گلِ باغ ‌ ‌ ‌ پھولے اس پر نہ مرغِ بستانی
حسنِ "باقی" نے دل کو کھینچ لیا ‌ ‌ ‌ رخصت۔ اے حسنِ ہستیٔ فانی
طمعِ زر کیا ہے؟ عافیت سوزی ‌ ‌ ‌ مسکنت کیا ہے؟ سلطنتِ ثانی

رازدانِ مدعا کو کہتے ہیں ‌ ‌ ‌ "حسنِ اُلفت کا داغِ پیشانی"
دل ہے وقفِ رجائے رحم و کرم ‌ ‌ ‌ جاں ہے نذرِ رضائے ربّانی
برقِ نظارہ ہے فروغِ حیات ‌ ‌ ‌ بارِ دل کیوں نہ ہو گراں جانی؟
یوسفِ روح! مصرِ قدس میں جا! ‌ ‌ ‌ تن کو چھوڑ اے عزیزِ زندانی!

غم نہ کر ہے نقیبِ ابرِ بہار — خشکیٔ موسمِ زمستانی
دلِ [illegible]ہ کے اَلم گزیں ہوں — دیکھی جائیگی سبحہ گردانی
اب میں سمجھی۔ کہ ہے فنائے خودی — انبساطِ بہشتِ لافانی
مفت ہے مفت ہے۔ خدا کی قسم — جان کے بدلے۔ کمالِ روحانی
کر سکے طے نہ مُلکِ عرفان کو — رومیؔ[1] و مغربی و کرمانی
کنہِ رب سے عُلوم ہیں لاعلم — عربی سیکھ۔ خواہ عبرانی
تو نے سب کچھ پڑھا۔ پہ کچھ نہ پڑھا — نہ پڑھا علمِ نفسِ انسانی
قوتِ برقِ روح کو نہ سمجھ — سحر۔ افسونگری۔ پری خوانی
عرش کے کنگرے پہ طائرِ قدس — رات کرتا تھا یوں خوش الحانی
کہ ہے انسان طلسمِ شانِ خدا — قدر اپنی نہ اُس نے پہچانی
بند کیں اس نے جب ذرا آنکھیں — کھُل گیا رازِ بزمِ امکانی
حسنِ احمدؐ ہُوا ظہور پذیر — تھی یہ کیس نُور کی خود افشانی
آجکل "مادّہ" ہے زوروں پر — الغیاث اے حکیمِ روحانی
عشق[2] کے فلسفہ کو چھوڑ دیا — دیکھنا عقل کی تن آسانی
ٹھوکریں کھائے کیوں قیاس پرست — دیدۂ دل اگر ہو نُورانی
جس عمل کا قیاس ہے آغاز — اس کا انجام ہے پشیمانی
حال پوچھا قضا نے جب آکر — رہ گئی ساری فلسفہ دانی
چارۂ روح فلسفی ہے نہ شیخ — ایک وہمی ہے۔ ایک خفقانی
عشق کی خردبیں نے دکھلایا — قطرہ میں طولِ عرضِ عمّانی
خاک میں انجلائے ہستیٔ پاک — ذرہ میں مہر کی درخشانی
بعُد میں قرب۔ پردہ میں جلوہ — جنس کی وقیت قحط۔ ارزانی

کثرتِ این و آں میں وحدتِ دوست — گنجِ نایاب کی فراوانی
شیخ! ارنج بیانِ راز نہ کر — لابیاں ہے یہ کیفِ وجدانی

متشکک ہے اور شکایتِ ہجر
ہم ہیں اور شکرِ لطفِ پنہانی

(۲)

بحرِ غم میں ہے سخت طغیانی — سر سے اوپر گزر گیا پانی
کب تک اے خاطرِ حزیں! کب تک — شورِ "یارب" سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھونے سے — کہیں بنتے ہیں کام دیوانی!
دردِ دل دردآفریں کو سُنا — کر گزر۔ جی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشتِ وحدت ہے۔ دشتِ وحدت ہے — دیکھ آہستہ کر فرس رانی
بے خبر! پہلے نقش کر دل پر — عظمتِ بارگاہِ یزدانی
مائیہ رشک۔ یاں بضاعتِ مور — ہیچ واں شوکتِ سُلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا — پہلے کر جان و دل کی قربانی
چاہیئے بہرِ نذرِ جنس گراں — چاہیئے خون کو نُبشَد افشانی
صدفِ فکر سے نکال گہر — تر بتر کر عرق سے پیشانی

آج اک بے نوا ہے ہدیہ بدست — ہو قبولِ جنابِ سُلطانی
ہدیہ کیا۔ ایک سادہ دفتر پر — لکھ کے لائی ہوں لفظِ "لاثانی"

دین ہے اُلفت۔ وطن فغانستان
عرف مجنوں ہے۔ پیشہ حسّانی

ز۔ خ۔ ش آف علی گڈھ

---

[1] تین مشہور صوفی شعرا [2] عشق حقیقی سے مراد

جذباتِ عالیہ

طباطبائی

آپ کو میرے دلِ زار سے کچھ کام نہیں!
خیر یونہی سہی۔ تکرار سے کچھ کام نہیں

رشکِ نجمِ سحری ہے ترا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شبِ تار سے کچھ کام نہیں

مجھ کو طوطی کی طرح ذوقِ نواسنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک رُوح گذر جاتے ہیں
خلشِ وادیٔ پُرخار سے کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہوں۔ میں ہوں دامانِ نسیم
مجھ کو خارِ سرِ دیوار سے کچھ کام نہیں

مرکزِ صبر و سکوں زیرِ قدم ہے اپنے
گردشِ گنبدِ دوّار سے کچھ کام نہیں

سعد و نحس اپنا ہے۔ اپنا ہی سکون و حرکت
کوکبِ ثابت و سیّار سے کچھ کام نہیں

اپنا مُنہ اشکِ ندامت میں نظر آتا ہے
مجھ کو آئینۂ پندار سے کچھ کام نہیں

اُس کے جاتے ہی چلی چاندنی بھی گھر سے مرے
کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں

موج مارے جو غمِ دل تو فلک تک پہنچے
اس کو لیکن لبِ اظہار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بندِ پیمبر کا ہوں شیدا اے نظم!
پسرِ ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

وحشت

ترا حسنِ خود آرا دہر میں ہے جلوہ گر مجھ سے
ترے انداز پیدا ہیں باندازِ دگر مجھ سے

نتیجہ موجبِ عبرت ہے شب کی بزمِ عشرت کا
کہا رو رو کے قصۂ شمع نے وقتِ سحر مجھ سے

نمونہ تیرگیٔ قبر کا ہے شب کی تاریکی
کفن کا ذکر کرتی ہے سپیدۂ سحر مجھ سے

معافی کے نہ تھی قابلِ محبت کی خطا شاید
کہ جب بگڑے تو بگڑے ہی رہے وہ عمر بھر مجھ سے

تغافل ہے ادا اور میں ادا دانِ محبت ہوں
خبر ہے خوب مجھ کو، تو نہیں ہے بے خبر مجھ سے

وہ جرمِ عشق کی تفتیش میں ہیں۔ دل لرزتا ہے
چھپائی جائے گی کیونکر محبت کی نظر مجھ سے

مجھے دینا نہیں منظور اُن کو طعنِ بیدادی
کہا جائے گا کیونکر قصّۂ دردِ جگر مجھ سے

طوافِ کعبۂ مقصود اب قسمت میں ہے وحشت!
تقاضا سجدے کا کرتا ہے اُس کا سنگِ در مجھ سے

رضا علی وحشت

وجاہت

کیوں دلفریب وضع نہ ہو مہر و ماہ کی
دونوں یہ ٹوپیاں ہیں کسی کجکلاہ کی

آنے دیں اپنی زلف کو وہ کان تک ذرا
یہ ترجمان ہے مرے حالِ تباہ کی

محشر میں دل بھی اُن کا طرفدار ہو گیا
نیّت بدل گئی ہے ہمارے گواہ کی

رکھتے ہیں لاگ اُس شہِ خوباں سے جاں نثار
بگڑی ہوئی تمام رعیّت ہے شاہ کی

مٹّی سے میکدے کی ہم اے شیخ بعدِ مرگ
بُنیاد ڈالدینگے تری خانقاہ کی

نکلو ہمارے خانۂ دل سے تم اے بتو!
کعبے میں اب نہیں کوئی صورت پناہ کی

خنجر چلا رہے ہیں وہ حلقوم پر مرے
تصویر کھینچ لے کوئی اب قتل گاہ کی

قاتل پڑا نہیں مرے دل پر نشانِ زخم
تصویر کھنچ گئی ہے یہ تیری نگاہ کی

وقتِ سفر قریب وجاہت حسین ہے
کچھ فکر چاہیئے تجھے اب زادِ راہ کی

جوش

مجھے تعلیم دی ہے یہ مری فطرت نے بچپن سے
چمن میں رو رہا ہے کون رل رل کر نشیمن سے

ادب کو دخل دے، اس بحر میں لہریں ہیں وحدت کی
بلندی عرش کی اُس کی سرافرازی سے جھکتی ہے

بھرے آنکھوں میں آنسو عذر خواہی کے لئے آیا
مِلائے ہیں یہ کس اُستاد نے پردے، کہ آتی ہیں

نچھاور کے لئے حسنِ ازل! لایا ہے اک شاعر

کوئی روئے، تم آنسو پُوچھ لینا بڑھ کے دامن سے
کوئی کہہ دو کہ شادابی اُڑی جاتی ہے گلشن سے!

غبارِ ماسوا! ہٹ کر ذرا شاعر کے دامن سے
تری حرمت پہ۔ جس کا سر جُدا ہوتا ہے گردن سے

صفائے نفس تو نے کہدیا میرے دُشمن سے؟
صدائیں ایک سی اب بربطِ شیخ و برہمن سے

چُنے ہیں اُس نے تازہ پھُول کچھ فطرت کے گلشن سے!!

الہٰ آباد اب ہم عنقریب اے جوش جائینگے
لپٹ کر رو دینگے جی کھول کے اکبر کے مدفن سے

تپش

جب سے دل حسرت نوازِ ہوش ہے
سر گرانجانی سے بارِ دوش ہے
آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں
زندگی میری فنا آغوش ہے
منتظر ہے کس کی ؟ اے بادِ خزاں!
میری شمعِ آرزو گلپوش ہے !
رنگِ رُخ تفسیرِ حرفِ مُدعا
جنبشِ لب معنیٔ خاموش ہے
اشکِ گلگوں شمع افروزِ حیات
دردِ غم طاقت ربائے ہوش ہے
دیدۂ پُر شوق کیسا انتظار ؟
حسرتِ فردا تو محوِ دوش ہے!
دے رہی ہے موت تسکینِ وصال
دردِ دل درماں سے ہم آغوش ہے
ہوگئی پیشِ نظر دنیائے یاس
یہ تماشائے وداعِ ہوش ہے!
شورشِ نظارہ ہے آتش فشاں
ذرہ ذرہ طُورِ در آغوش ہے
نقشِ حیرت ہوگیا طرزِ جنوں
سازِ وحشت نغمۂ خاموش ہے
اے تپش! سرشار ہیں مستانِ عشق
ہر طرف گلبانگِ نوشا نوش ہے!

تاجور

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے
خلشِ عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائیگا۔ ایسا نظر آتا ہے مجھے
رونقِ چشمِ تماشا ہے مری بزمِ خیال
اِس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے
عبرت آموز ہے۔ بربادیٔ دل کا نقشہ
رنگِ نیرنگیٔ دُنیا نظر آتا ہے مجھے!!
وادیٔ عشق ہے وحشت کدۂ ویرانی
ایک اک ذرّے میں صحرا نظر آتا ہے مجھے!!
اُن کا ملنا ہے نظر بندیٔ تدبیر اے دل!
صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے
دیکھ کر تجھ کو ہُوئے نذرِ تحیّر مرے ہوش!!
کیا بتاؤں تجھے ؟ تو کیا نظر آتا ہے مجھے؟
رہتی ہے غمکدۂ دل میں تجلی اِس کی
دل میں اک داغِ تمنا نظر آتا ہے مجھے
بُت کو بُت جان کے پُوجوں تہیں کافر اے شیخ!
بُت میں بُت ساز کا جلوہ نظر آتا ہے مجھے
تجھ سے میں کیا کہوں؟ اے سوختۂ جلوۂ طُور!
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے
دل کے پردے میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
خلوتِ دل میں بھی پردا نظر آتا ہے مجھے
بچ رہا تھا فقط اک تاجورِ شعلہ طراز
وہ بھی بربادِ تمنا نظر آتا ہے مجھے

فہرستِ مضامین بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — نمبر ۳

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

-•-✳-•-

ہمایوں کیجانب سے سو روپے

کا

اِنعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً ''ہمایوں'' سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدت نے یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اہلِ قلم کو بیگاری کے درجے سے بالاتر سمجھے۔ اِسی لئے اُسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کردیا گیا کہ جو پُر مغز و پُر معلومات، اچھوتے مضامین محنت و کاوش سے لکھے جائینگے۔ صاحبِ مضمون کے ایما پر اُنکا معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اِسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں اوّلیت کے معیار پر پورا اُترے ہمایوں کے سرمایہ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطورِ انعام پیش کئے جائینگے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پورا نہ اُترے مگر ان میں بعض مضامین مفید اور جاذبِ توجہ ثابت ہوئے تو اول و دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کیجائیگی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رکن آنریبل خان بہادر شیخ عبد القادر بی اے بار ایٹ لا جج ہائی کورٹ پنجاب ہونگے باقی دو ''ہمایوں'' کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پُر مغز و پُر معلومات اور مدلّل پیرایہ میں لکھے جائیں۔

(۵)۔ مضامین فلسکیپ سائز کے زیادہ سے زیادہ تیس ۳۰ اور کم سے کم دس ۱۰ صفحات پر ہونے چاہئیں۔

(تاجور)

شذرات

ہماری خواہش ہے کہ "ہمایوں" کا حصۂ نظم باعتبارِ حسنِ انتخاب بہت بلند پایہ ہو۔ اس میں حتی الامکان کوئی ایسا شعر خواہ وہ کسی کا ہو درج نہ کیا جائے۔ جو غیر متین و غیر موثر ہو۔ جسے بھرتی کا کہا جا سکے جس میں کوئی بات نہ پیدا کیگئی ہو۔ تخیل کی ندرت اور اسلوب بیان میں کوئی اچھوتا پن ہو اگر حضرات سخن طراز ہماری مدد کریں تو یہ خواہش "ناممکن الحصول نہیں ہے اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اہلِ نظم پہلے ایک غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے اپنی نظموں کو خود دیکھیں اور انتخاب کا حق ادا کریں۔ اسکے بعد پھر یہ غیر خوشگوار فرض یہ کہتے ہوئے ہمیں سونپ دیں کہ

"تو دانی حساب کم و بیش را"

ہم چشم پوشی و مروت کو سپرد نسیان کر کے جو اشعار درج کر دیں تو ہماری جائز قطع و برید پر چین بجبیں نہ ہوں۔ ذرا سے ایثار کی ضرورت ہے۔ ان دو انتخابوں کے بعد جو شعر درج ہونگے یقیناً پھر وہ شعر نہیں ہونگے سحر ہونگے لیل و نہار کی گردش اُن پر اثر انداز نہ ہو سکیگی۔ سب سے پہلے اس نصیحت پر ہم کاربند ہوتے ہیں اور اپنے بائیس اشعار میں سے مذکورہ بالا دو بیدردیوں کے بعد چھ شعر درج کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کے مایۂ ناز سحر نگار اپنی چھائی ہوئی شہرتوں اور جغادری شخصیتوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس قابل قدر ایثار پر بخندہ پیشانی آمادہ ہو کر اردو شاعری کو زندہ قوموں کی شاعری بنانے میں سرگرمِ عمل ہو جائینگے۔

اک علم دوست شخصیت نے سال بھر کے لئے پانچ ایسے مستحق طالب علموں کو ہمایوں مفت عطا کرنیکی خواہش ظاہر کی ہے جو ادبیات سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم نے مدارس ذیل پر اس عطیہ کو تقسیم کر دیا ہے۔ دار العلوم دیوبند[۱]۔ ندوۃ العلما لکھنو[۲]۔ الٰہیات کانپور[۳]۔ جامعۂ اسلامیہ علیگڈھ[۴]۔ بنارس ہندو یونیورسٹی[۵] لہٰذا ان مدارس کے منتظموں کی خدمت میں التماس ہے کہ اپنی اپنی درسگاہ سے ایک ایک ایسے طالب علم کے نام سے ہمیں مطلع فرمائیں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ہی کوئی ادبی رسالہ خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

ہم مہاشہ سدرشن جرنلسٹ کا (جو چھوٹی چھوٹی دلچسپ و نتیجہ خیز کہانیاں لکھنے کی وجہ سے پنجاب کے پریم چند کہلاتے ہیں) شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے محفلِ ادب کے لئے ہندی و گجراتی زبان کے بلند پایہ رسالوں کے تازہ ترین نمبروں میں سے دلچسپ اقتباسات کا ترجمہ عنایت فرمایا اور اس عدہ کے ساتھ کہ یہ سلسلۂ عواطف غیر منقطع ہوگا۔

ہندوستان کی نسوانی دنیا میں ز۔خ۔ش۔ صاحبہ مرحومہ کی اچانک موت کی خبر رنج و اندوہ سے سنی جائیگی۔ یہ پیکرِ کمال نہ صرف مسلمان عورات کے لئے بلکہ کل ہندوستانی نسوانی طبقہ کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ اس قابلیت کی عورتیں ہندوستان میں بہت کم ہونگی۔ مرحومہ اردو کی اک غیر معمولی شاعرہ تھی انکی آخری نظم "لذتِ عرفان" جو انہوں نے خاص "ہمایوں" کے لئے لکھی تھی فروری کے "ہمایوں" میں باصرہ فروز ہو چکی ہے۔ خدائے تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگاں کو صبرِ جمیل۔

تاجور

جہاں نما

ہم خود۔ حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو آج کل ہندوستان ہی ہمارے لئے جہاں نما ہے۔ دُنیا کی تازہ ترین تحریک کا مرکز یہی مُلک ہے۔ دُنیا بھر کی نظریں ہماری طرف لگی ہیں اور خود ہم کتنا بھی باہر کو نگاہ دوڑانا چاہیں ہماری آنکھیں اندرونی حالت دیکھنے کو بند ہوئی جاتی ہیں۔ ہم نہیں جانتے ہم کہاں ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں۔ پہلے ہم مُردہ قوموں میں شمار ہوتے تھے آج اتنے زندہ ہو چکے ہیں کہ زندگی کے جوش میں ہم میں سے بعض آتشِ موت میں قدم رکھنے سے دریغ نہیں کرتے۔ آخر وہ کونسا انقلاب ہے جس نے خاموشی کے ساتھ خواب کو بیداری مجبوری کو رضاکاری اور غفلت کو ہوشیاری میں تبدیل کر کے پُرانی دُنیا کو اک نیا جنم دیدیا ہے۔ سب جماعتیں اقرار کرتی ہیں کہ ہندوستان اَور کا اَور ہو گیا ہے لیکن سبھی اس کا احساس بھی کرتی ہیں کہ موجودہ حالت خطر سے خالی نہیں۔

"مُصورِ فطرت" کے لفظوں میں ہم بھی دست بدعا ہیں کہ "اے ہر دوار کے دوارے رہنے والے! سُن اور دیکھ! امیدیں ڈوب رہی ہیں۔ ارمان جل رہے ہیں۔ ماتم برپا ہے نوحوں کا شور مچ رہا ہے یہ ملکِ ہندوستان! اس کو تیری امان! فساد و خونریزی قحط و بیماری کاہلی و بیکاری سب آفتوں سے جو زمین کی ہوں یا آسمان کی، مشرق کی ہوں یا مغرب کی، دین کی ہوں یا دُنیا کی حفاظت دے۔ حفاظت دے!!

قرض خواہِ مغرب۔ فتح مند اتحادی امریکیوں کے بارِ قرض کے نیچے دبکے پس رہے ہیں۔ انگلستان پر امریکہ کا قرضہ ایک ارب پچیس کروڑ پونڈ تک پہنچ چکا ہے۔ انگریزی اخبار آؤٹ لک اہلِ امریکہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے "صاحبو! ہم نہیں کہتے کہ اس بارِ عظیم کا ہمارے سر سے اُٹھا لینا آپکی فیاضی یا عالی ہمتی ہوگی بلکہ ایسا کرنا آپ ہی کے لئے مفید ہوگا۔ آپکی تجارت ہمارے مقروض ہونے کے باعث خستہ حالت میں ہے آپ کے لاکھوں مزدور اسی سبب سے بیکار پڑے ہیں اور آپکی صنعتیں اسی وجہ سے پریشان حالی میں ہیں۔ ہماری رائے میں آپ یہ قرضہ ضرور ہی چھوڑ دیں گے"۔

انگریزی چانسلر نے اعلان کیا ہے کہ انگلستان نے اس بھاری قرضے کا سُود ادا کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ سُود پچاس کروڑ پونڈ سالانہ ہوگا۔

جلسہ آفرینی۔ دُنیا میں کم پیشہ وروں کو ایسے عجیب کام سے سابقہ پڑتا ہوگا جیسے اُس شخص کو جو پارلیمنٹ کی ممبری کے اُمیدواروں کے لئے لوگوں کو گلی کوچوں میں جمع کرتا ہے + مشہور گذرگاہوں میں تو وہ سڑک کے بیچ میں کھڑا ہوکر آسمان کی طرف ایک فرضی چیز کو دیکھنے لگتا ہے لیکن چُپ چاپ کوچوں میں اُسے اس کام میں بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں۔ وہ کھڑا ہوکر ایک فرضی آدمی کو "ہی ہی" کرکے پُکارتا ہے اور چند لمحوں کے بعد نہایت زور سے چیختا ہے کہ "جون جون! تم جارہے ہو؟ دیکھئے دیکھئے جواب تک نہیں دیتا۔" یہ شوروغل سُن کر لوگ جمع ہونے شروع ہوجاتے ہیں اتنے میں مُقرر آدھمکتا ہے اور تقریر کرنے لگتا ہے +

شادی اور شادمانی۔ بحرالکاہل کے جنوبی حصے میں (نیو ہیبریڈیز کے مجمع الجزائر میں) ایک جزیرہ مالی کولا ہے جہاں کی اکثر شادی شدہ عورتوں کے دو اگلے دانت نہیں ہوتے + گاؤں کی بڑھیا عورتیں لڑکی کی منگنی کے وقت اُس کے دو دانت اُکھاڑ دیتی ہیں جس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اب دوشیزگی کا زمانہ ہو چُکا +

ایک اور عجیب دستور یہ ہے کہ ہر ننھی بچّی کے سر کے گرد ایک رسی مضبوطی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے جس سے اُس کا سر بیضوی رہنے کی بجائے آہستہ آہستہ مخروطی شکل اختیار کرلیتا ہے جن لڑکیوں کے سر اس وضع کے بن جائیں وہ خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں +

معلق گاڑی۔ برلن اور ہیمبرگ کے درمیان ایک ریل گاڑی چلتی ہے جس کی لائن بجائے زمین پر نصب ہونے کے ہوا میں معلق ہوتی ہے۔ یہ لائن ایک نہر کے اوپر بنائی گئی ہے جس کے ساتھ لٹک کر گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے + (ب ل)

نیویارک (امریکہ) میں "وُلورٹ" دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے۔ سطح زمین سے (۷۹۲) قدم بلند اور زمین میں اس کا عمق (۱۵۰) قدم تک ہے۔ اس کی ساٹھ منزلیں ہیں۔ چار سو دارالمطالعے ہیں اس عمارت کا ایک اعلیٰ افسر ہے جس کے ماتحت چار سو آدمی عمارت کے مختلف حصّوں کا انتظام کرتے ہیں۔ سات لاکھ پونڈ سالانہ اس کا خرچ ہے +

(تاجور) الہلال (مصر)

علمی شعاعیں

موجِ خیال۔ ایک حیرت انگیز آلہ ایجاد ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعاعیں آنکھ میں سے نکلتی ہیں اور انہیں قلمبند کیا جا سکتا ہے۔ یہ آلہ ایک قسم کا "برق پیما" ہے جس کے ذریعے سے ننھی سے ننھی برقی موجوں کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ جب نظر "برق پیما" پر جما دی جاتی ہے تو ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظر میں کوئی ایسی شئے ہے جو باہر کو ضیاء ریز ہو کر خود بخود حرکت پیدا کرتی ہے۔ تعجب نہیں اگر آیندہ یہ دریافت ہو کہ ہر نگاہ کے ساتھ خیال بھی ہم رکاب ہوتا ہے۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خیال اثیر میں حرکتِ موج پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس بات میں بھی کچھ شک نہ رہے گا کہ ایک شخص ہندوستان میں بیٹھا ہوا لندن میں ایک ہم جنس پر اپنے خیالات کا اثر ڈال سکتا ہے۔ اثیر کی موجیں طوالت میں مختلف ہوتی ہیں۔ "عکسی" شعاعیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لاکھوں ایک ہی انچ میں سما جاتی ہیں اور بے تار کی موجیں بعض اوقات پانچ پانچ میل طویل ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ خیال کی موج ہزاروں میل طویل ہو یا شاید بہت چھوٹی سی ہو اور اس حالت میں ایک خیالی موج جو کسی زبردست خیال کے باعث حرکت میں آئے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کریگی حتیٰ کہ وہ ایک ہمخیال دل تک رسائی پا لے۔

ایک موم بتی۔ نیویارک کے ایک گرجے کو ایک موم بتی مشہور مُغنی کیروزو کی یادگار کے طور پر ہدیۃً دی گئی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بتی سنہ ۶۹۲۱ء تک برابر جلتی رہے گی (اگر دُنیا کا اس سے پہلے ہی خاتمہ نہ ہو گیا) اس کا وزن ۵۰۰ سیر ہے۔ اس پر حضرتِ مسیحؑ کی تصویر منقوش ہے اور تمام اُن لوگوں کے نام بھی اس پر کندہ ہونگے جنھوں نے اس کے تیار کرنے کے لئے چندہ دیا۔ موم بتی ہر سال کیروزو کی پیدائش کے دن ۲ نومبر کو روشن کی جایا کرے گی اور اس میں اتنا موم ہے کہ وہ پانچ ہزار برس تک جل سکے گی۔ وہ متواتر ایک لاکھ بیس ہزار گھنٹے جل سکتی ہے یا تقریباً ۱۴ برس۔ نیویارک کے اطالوی یتیموں نے یہ موم بتی گرجے کو دی ہے۔ کیروزو نے ان بچوں کی اپنے کمالِ فن سے عمر بھر اعانت کی۔

امریکی اخبارات۔ دُولِ متحدہ (امریکہ) میں ۲۳ ہزار سے زائد اخبارات چھپتے ہیں۔ ان میں ۲۵۰۰ روزانہ اخبار ہیں باقی ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو یا تین بار چھپنے والے۔ رسالے ان میں شامل نہیں ہیں + شکاگو کے شہر میں ۴۰ روزنامے ہیں جن میں سے صرف ۱۲ انگریزی زبان میں ہیں۔ باقی ماندہ جرمن۔ بوہیمی۔ پولی۔ ہنگری۔ اطالوی۔ سلوویکی زبانوں کے اخبار ہیں۔ لیکن فرانسیسی کا کوئی روزنامہ نہیں ہے + امریکی لوگ اخبارات کے اتنے مشتاق ہیں کہ پچیس ہزار کی آبادی والے چھوٹے شہروں میں بھی ایک روزنامہ ضرور ہوتا ہے۔ کاروباری آدمی کی بھوک ہر روز تین چار اخباروں سے پوری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی بچے اور اخبار پڑھتے ہیں + اس جوع الاخبار کی وجہ ہے کہ ایک ایک امریکی اخبار دن میں کئی دفعہ چھپتا ہے۔ اور یہ عجیب واقع دیکھنے میں آتا ہے کہ صبح کے اخبار شام تک چھپ چھپ کر بکتے ہیں اور شام کے اخبار صبح کے نو بجے تک اپنا آخری ایڈیشن شائع کرتے رہتے ہیں +

دنیائے اسلام میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ دولتِ خداداد افغانستان کی علمی بیداری اب ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی صورت میں رونما ہونیوالی ہے۔ کابل کے سفیرِ یورپ جنرل والی محمد خاں اس یونیورسٹی کے لئے سائنس کے فرانسیسی اور امریکن پروفیسر بہم پہونچا رہے ہیں +

تاجور امان افغان

لاہور کی مشہور نوتعمیر کردہ بوٹوں کی دکان "کرنال شاپ" کی پیشانی پر ہندوستان کے حیرت کار خوشنویس منشی دین محمد صاحب نے جلی حروف میں چوبیس انچ قط کے قدِ آدم قلم سے "کرنال شاپ" لکھا ہے۔ جس کا لام اٹھارہ فٹ لمبا ہے۔ اور پ بائیس فٹ لمبی سبکدستی کا کمال یہ ہے۔ کہ اپنے تن کی برابر قلم سے یہ حروف لکھے ہیں۔ مگر حروف کی نوک پلک اور باصرہ فروزی کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قلم کے قط کی چوبیس انچ چوڑائی ور حروف کی بائیس فٹ لمبائی فنِ کتابت کی خوبیوں میں حارج ہوئی ہے۔

مالکانِ دکان نے اِن دو حرفوں کی اُجرت دوسو روپے ادا کئے +



نسوانی دُنیا

مستورات مصر کی مرکزی سیاسی انجمن کا ایک وفد لارڈ کرزن کی پیش کردہ شرائط کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے لارڈ ایلنبی گورنر مصر کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا عزیزہ علی فوزی صاحبہ نائب ناظم کی جانب سے روزنامہ "المقطم" (مصر) میں وفد کا بیان شائع ہُوا ہے۔ اس بیان کے تہوّر آمیز لہجہ کو دیکھتے ہُوئے مصر کی حیرت انگیز نسوانی بیداری کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ المقطم (مصر)

ہمارے اس برّاعظم میں بھی یادش بخیر اک "آل انڈیا لیڈیز کانفرنس" قائم ہوئی تھی۔ لیکن مُدت ہُوئی وہ خوابِ پریشاں کثرتِ تعبیر کی نذر ہو چکا ۔

مصر کی اک مشہور انشا پرداز سیدہ روز حداد نے "مجلۃ السیدات" کے نام سے ایک گرانمایہ علمی۔ ادبی۔ اجتماعی۔ نسائی ماہوار رسالہ جاری کیا ہے۔ یہ رسالہ مصر کے منتخب ادبی رسالوں میں شمار ہوتا ہے ۔

ہندوستان میں بھی بنگالی اور ہندی زبان کے بلند پایہ رسالے عورتوں کی ادارت میں شائع ہو رہے ہیں لیکن ایک بدقسمت اُردو ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ رائج گوشہ گوشہ میں اس کی تعلیم مگر اس کا ایک بھی ایسا قابلِ ذکر نسوانی رسالہ یا اخبار نہیں جو کسی تعلیمیافتہ عورت کے مطالعہ کے لائق ہو۔

الہلال (مصر) کے تازہ نمبر میں "المرأۃ الجدیدۃ" (جدید زمانہ کی عورت) کے عنوان سے ایک معرکۃ الآراء مضمون شائع ہُوا ہے جس میں دورِ جدید کی مشرقی و مغربی عورتوں پر بسیط تبصرہ کے بعد عورتوں کے متعلق مشاہیر اہل الرائے کے اقوال درج کرتے ہُوئے قابل مضمون نگار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

لڑکیوں کے سرپرست (مربی اثنائے تربیت میں) یہ خیال ضرور رکھیں کہ عورت کا سب سے پہلا اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ امورِ خانہ داری میں دلچسپی لے۔ اپنے بچوں کی غور و پرداخت کا خیال ہر وقت پیشِ نظر رکھے۔ اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اُسکے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا کتنا بوجھ ہے، اور وہ ان ذمہ داریوں سے کیونکر سبکدوش ہو سکتی ہے ۔ تاجور الہلال

ہندوستان کے مسخ شدہ طبقے کو مبارکباد ہو کہ لیجسلیٹو اسمبلی نے بہ کثرت رائے یہ تجویز منظور کرلی ہے کہ عورتوں کو حق انتخاب دیا جائے۔ ب

خزاں

خزاں کا دن تھا!——— زرد پتّیاں درختوں سے جھڑ جھڑ کر تیز بہنے والی آبجو میں گرتی تھیں اور بہتی جاتی تھیں، مرجھائے ہُوئے پھُولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں اور پارہ پارہ ہو کر گردِ راہ ہُوئی جاتی تھیں!

وہ اپنے دریچے میں بیٹھی حُسنِ قدرت کی پژمردگی کا یہ سماں دیکھتی تھی اور اُس کے خیالات فضائے گلشن میں اُداسی کے ساتھ محوِ پرواز تھے۔ خود اُس کی فطرت کو کوئی غم لاحق نہ تھا کیونکہ اُس کے لئے زندگی بہارِ شباب کے پھُولوں سے مُعطّر تھی لیکن اِن غافل خوشیوں میں قدرت کے حُسن کی پریشاں حالی اُسکے نفس پر اک ابرِ سیاہ کی طرح چھائی ہُوئی تھی!

"کچھ یہی حال میرا ہوگا،" وہ بولی، "دو دن کی بہار پر عبث غرّہ ہے جب آخر حُسن کو زشت نمائی کا سامنا ہے جب یُوں بہار کو خزاں سے واسطہ ہے اور زندگی کو موت سے! گلشنِ فطرت میں کوئی کیوں پھلے پھُولے؟ بزمِ عشرت میں کوئی کیا محوِ طرب ہو جب مسرّت کا انجام مشقت اور گویائی کا نتیجہ ابدی خاموشی ہے!"

× × × اور اُداسیاں پھر اُس کے دل پر تاریکیاں بن کر چھا گئیں!

چُوں چُوں کرتی اک چڑیا اُس کے پاس سے گذر گئی، درخت کی پتّیاں ہنوز جھڑ جھڑ کر ہوا میں بکھر رہی تھیں لیکن چڑیا اپنے چہچہوں میں مصروف و مطمئن تھی اور چاروں طرف خوشی کے نغمے گاتی ہُوئی اُڑ رہی تھی!

اُس نے حیرت سے چڑیا کو دیکھا اور کہا "تیرے پھُول مُرجھا گئے، جن پتّیوں میں تیرا کاشانہ تھا وہ زرد رُو ہو کر مٹّی میں مٹّی ہو گئیں اور تُو اپنا گانا گا رہی ہے!"

"ہاں! لیکن خوشی کبھی نہیں مرجھاتی" چڑیا نے مُسکرا کر کہا "اور یُوں بھی پژمردگی حُسن کی بہترین نگہدار ہے"!

حسینہ نے اک آہ بھری اور کہا "پژمردگی اور حُسن! میں نے تو حُسن کو ہمیشہ شگفتہ ہی دیکھا ہے۔ اے چڑیا! کیا تو خزاں کا پیغام سُنا کر بہار کے دلدادوں کی پھبتی اُڑاتی ہے؟

ہلکی ہلکی نسیم کے غمّاز جھونکوں نے یہ باتیں ننھی پنکھڑیوں کی طرح چمن کے کونے کونے میں پھیلا دیں!

چڑیا چوں چوں چوں چوں کرتی اُڑ گئی اور سوکھے ہوئے درختوں ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اک جھاڑی کے قریب جا بیٹھی جس میں چند ہرے پتے اور صرف ایک کھلا ہوا پھول موجود تھا اور باقی حسن کی مورتیں پیوند خاک ہو چکی تھیں!

"اب میں تجھ سے جدا نہ ہونگی" وہ گویا ہوئی "شیریں پھول! تو مجھے پیارا ہے" لیکن بہار کے آخری پھول نے منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔

چڑیا نے ذرا حسرت سے کہا "محبت بھی کتنی دشوار ہے" لیکن پھول نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہاں اُسکی کمھلاتی ہوئی پنکھڑیوں سے یہ ٹوٹی ہوئی آواز پیدا ہوئی کہ "اگر پژمردگی حسن کی بہترین نگہدار ہے تو اے چڑیا! شگفتگی لاحاصل ہے" تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی اور پھول آزاد ہو گیا"۔

چڑیا بدحواس ہو کر اُڑی اور سوکھے ہوئے درختوں اور ویران گلزاروں کا چکر لگاتی ہوئی اُسی دریچے کے قریب جا پہنچی جہاں اک انسانی پھول اپنی بہار کے خیال سے سرنگوں ہو رہا تھا۔ چڑیا کے کان میں یہ لفظ گونج رہے تھے "تو پھول کی وہ باتیں بھول گئی" اُس کا دل شاید ہمیشہ کیلئے پژمردہ ہو جاتا اگر حسینوں کی دنیا میں اپنے محبوب کی بھولی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کرنا اُس کی زندگی کی تنہا باقی مسرت نہ ہوتی۔

چڑیا نے کہا "اے حسینہ! غم نہ کر حسن پژمردگی و شگفتگی سے آزاد ہے اور آزادگی ہی حسن کی بہترین نگہبان ہے۔ غم نہ کر اے حسینہ! اور اُن رس بھری باتوں کو سن لے جو ایک بوستانی پھول نے شاید اک انسانی پھول کی شادابی کے لئے میرے گوش گذار کی تھیں۔

"حسن کی دنیا میں ظاہر باطن سے جدا نہیں، جو کچھ نظر آتا ہے وہ اَن دیکھے کا جلوہ ہے! لیکن جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ بھی فریب کاری نہیں اگر تیرا دل ہی تجھے دھوکا نہ دے۔ زشت نمائی تو محض بھٹکی ہوئی آرزو کی کج نظری ہے اور اُس کا وجود حقیقت میں نیستی۔ حسن ہر جگہ بکھرا پڑا ہے اور کونسی شے حسین نہ ہوگی جب حسن ہی کائنات کا پیدا کرنے والا ہے! چند روزہ حسن کو دل نہ دے اور دل دے تو اُس کی خزاں کو بہار سے جدا نہ دیکھ! کیونکہ بہار حسن گویا ہے اور خزاں خاموشی حسن! ــــ کون کہہ سکتا ہے کہ شاہد حقیقی کی خاموشی اُسکی گویائی سے زیادہ دلکش نہیں؟ اُسکی کونسی ادا دل دینے کے لائق نہیں؟ اور کونسا جلوہ ہے جس پر دنیا حسن کے ہزاروں پھول نچھاور نہ کر دے؟!

بہار و خزاں تو نگاہِ کوتاہ بیں کی سراب آفرینیاں ہیں اور اگر تو چاہتا ہے کہ حسن کو ہمیشہ شگفتہ دیکھے تو راست روی اختیار کر کہ فقط راستی ہی ابدی مسرت ہے اور صرف حقیقی مسرت دائمی حسن!!

بشیر احمد

تحقیق الالسنہ

گذشتہ سے پیوستہ

(۸) عربی شرح تمام دنیا کے الفاظ کی لازمی خصوصیات کو ظاہر کردیتی ہے۔ برخلاف عجمی زبانوں کی شروح کے جن میں قلتِ الفاظ کے باعث صرف سطحی مناسبت کے اظہار کی بھی بمشکل گنجایش ہے۔ اِس لئے علوم کے اصطلاحی الفاظ کی شرح میں صرف اس خیال سے مایوس نہ ہونا چاہیئے کہ عربی جاہل بدویوں کی زبان ہے جن کو آج تک کبھی علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یا الفاظ اصطلاحات یورپین زبانوں میں ہیں اور زمانۂ حال کی ایجاد ہیں اور ان کے ترجمہ یا خود الفاظ اب تک یورپ کے سوا دوسرے ممالک میں شائع ورائج نہیں ہوئے ہیں۔ کیونکہ عربی دراصل ابتدائی زبان انسان کی ہے اور اپنے حال پر اب تک قائم ہے یہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح دوسری قدیم زبانوں کے بہت سے الفاظ متروک ہوکر گم ہوگئے۔ یا بعض موجودہ الفاظ کے سابقہ معانی میں سے کچھ گم ہوگئے۔ اسی طرح عربی کے الفاظ و معانی بھی گم ہوگئے ہونگے۔ مگر اب تک بھی عربی میں اس قدر گنجایش باقی ہے کہ ہر زبان کے ہر قسم کے الفاظ کی شرح کے لئے صرف ایک کتاب منتہی الارب کافی ووافی ہے۔ میں نے ہزار ہا الفاظ مختلف زبانوں کے مشکل سے مشکل انتخاب کرکے اس کتاب میں دیکھے اور اسی کام میں مَیں پانچ برس سے لگا ہوا ہوں مگر آج تک ایک لفظ کی بابت بھی ناکامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک روز خیال آیا کہ ستاروں کے ہندی نام جو ہفتہ کے دنوں سے منسوب ہیں انکو سنسکرت بتایا جاتا ہے۔ یہ اگر عربی سے حل ہوجائیں تو سنسکرت اور عربی کے اتحاد کی عجیب دلیل ہے۔ دیکھنا شروع کیا۔ تو تین گھنٹہ کی محنت سے مندرجہ ذیل شرح حاصل ہوئی جس کے بیان کرنے سے پہلے یہ بات بتادینی ضروری ہے کہ ستاروں کی لازمی خصوصیت جس نے انسان کو اُن کی طرف متوجہ کیا ہے ان کی چمک دمک اور روشنی ہے۔ اس لئے روشنی کا ذکر ستاروں کے ناموں میں ضروری ہے اور روشنی کے معنے رکھنے والے مادے ہی ان ناموں کی اصل ہونگے باقی خصوصیات فروعی ہیں ان کا ذکر بھی ساتھ ساتھ ہوتا گیا ہے۔

سُورج کا نام ایت جو اینتوار میں ہے۔ مادہ اُتے کا اسم فاعل مؤنث ہے۔ معنی عربی سورج

کے ہیں۔ مؤنث اس لئے کہا گیا کہ عربی میں سورج کو مونث بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے "وَاِذَا الشَّمس کوِرت"

سورج کا دوسرا سنسکرت نام آدت ہے جو بکرمادت (بکرماجیت) میں شامل ہے یہ عربی آء ضیئت" کا مخفف و مبدل ہے۔ آء اسم فاعل اَتے کا بمعنی آفتاب ضِیئت اصلاً ضِوئِیت بلفظ دال بوزن عِفریت اسم فاعل ضَوء کا تھا مگر وَ ماقبل مکسوری سے بدل جاتا ہے اِس لئے ضِیءِیت بن گیا جس کا مخفف دِت ہے معنی مجموعی۔ آفتاب روشن۔ ہوئے۔

سورج کا تیسرا ہندی نام بھان ہے وہ عربی باحان ازلوح مثل جابان ازجوب ہے باحان کے معنی۔ آفتاب نو برآمدہ۔ یا فقط باحاً ہے یا بان۔ ازبین۔ معنی سب کے آفتاب ہیں۔

سور یہ شعریۃ ہے یا سورج کا مبدل کیونکہ جَ یَ سے بدلتا ہے۔

سورج فاعل سرج کا ہے جس سے سراج بنا ہے سُورج کے معنی اسپ سفید رنگ و مُسَرّج یعنی زین کسا ہوا وروشن کنندہ"

سَن سورج کا انگریزی نام ہے عربی سَن بمعنی جِرم بلند وسخت روشن وتابان"

شید سُورج کا نام زبانِ ژند میں ہے یہ عربی مادہ شود سے بنا ہے جیسے حَیل بالفتح حَول سے معنی شید آفتاب۔

مِہر دوسرا فارسی نام سورج کا عربی مُحرَّ ازحَرَّ آفتاب بسیار گرم"

ہَور تیسرا فارسی نام سورج کا۔ خَور ستارۂ سخت روشن یا اَور آفتاب آتش رنگ یا حَوَر ازحَرَّ آفتاب۔

خور چوتھا فارسی نام سورج کا۔ عربی غورٌ آفتاب نیمروز یا قریب افق نمودار سے
"و خور از کوہ یکروز سر برنزد"

آفتاب۔ عربی میں آبَ طابَ ہے آبَ از ابَ بمعنی نیمروز طابَ ازطبّ بمعنی سورج یعنے مہر نیمروز۔

شمس عربی بمعنی آفتاب و اسپ سپید تیز رو و مار

سورج کے جس قدر نام دُنیا بھر کی زبانوں میں آئے ہیں ان میں سے اکثر میں معنی گھوڑے

اور سانپ وغیرہ کے آئے ہیں اسی سبب سے ایرانی اور ہنود عقائد میں سورج کے ساتھ گھوڑا اور سانپ معبود قرار پائے۔ مگر یہاں بخوف طوالت زیادہ تشریح کو ملتوی کیا گیا پھر کبھی دیوتاؤں کے حالات میں لکھیں گے۔

سوم یا چاند

سوم عربی میں سہوم از سہم ہے معنی ستارۂ سخت روشن باشعاع

سَسَس دوسرا نام چاند کا ہے عربی سَعسَع بمعنی ماہ اندک یا صَحص مثلہ از حصّ۔ سیم رنگ

مَوَن۔ انگریزی مخفف مَوَہُ یا مَوْہُون بوزن حَمدُون کا ہے بمعنی جرم نیکو تابان و درخشان

چاند عربی سَعَند از سعد ہے معنی ستارہ سخت روشن میمون" س چ متبادل

قمر عربی ہے معنی ستارہ سپید باندک تیرگی۔

ماہ فارسی از مَوَہ بمعنی ستارہ نیکو تابان و درخشان۔ سیم رنگ۔ اہل جوتش چاند کا رنگ سفید مانتے ہیں اور سورج کا سنہرا کیونکہ سعریہ جس کو سنسکرت میں سوریہ کہتے ہیں بمعنی آتشیں ہے۔

منگل

عربی مَنکَل از نکل ہے خواہ مرحب کے وزن پر فاعل سمجھو۔ خواہ ظرف معنی آتش دار سرخ عقوبت وعذاب رساں۔ چنانچہ رنگت سرخ ہے اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔

مرّیخ از مرخ عربی بمعنی سرخ رنگ ستارہ۔ یا اصلاً مُریش از ارش ہے مثل مِسکین از سکن۔ ش۔ خ متبادل۔ معنی مُریش آتش رنگ و تابان سخت

مارس یونانی عربی مَارَش از ارش مذکورہ۔ مثل مَنکَل ہے

ٹیوز انگریزی عربی طَیئُوس از طوس بمعنی ستارۂ روشن سرخی مایل۔ ساخت بوزن فَیعُول۔

بُدھ

عربی میں وُضَح ہے۔ معنی ستارہ روشن قدرے مائل بسیاہی۔ اہل جوتش اس کا رنگ نیلا مانتے ہیں قوم نوح کا بت وُدّ یہی وُضَح ہے ض کی قرءت د کے قریب ہے۔

عربی نام عُطارِد ہے مگر یہ مرکب ہے اصلاً عُو طارِد ہے عُو از عوی ستارہ طارد بمعنی سیارہ روشن یعنی کوکب سیارہ طارد میں معنی سیاہی مایل بھی ہیں۔

مرکری یونانی نام اصلاً مَر شَریّ ہے مگر اس کو یونانی میں لکھیں تو مرکری بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مَرّ
بمعنی روز چارشنبہ یعنی بدھ شَرِیّ ستارہ روشن یعنی بدھ کے دن سے منسوب ستارہ۔
وِڈَن انگریزی وِضحاً ہے معنی ستارہ روشن اَوڈن جرمنی اوضحاً عربی ہے معنی ستارہ بسیار روشن
برسپت یا برہسپتی
عربی میں برّاص فَتیح ہے برّاص درخشانی و تابانی ستارہ مائل بزردی۔ فتیح از فتح مالک و قابض۔
اسکو زرد رنگ بتایا جاتا ہے عربی مشتری از شری ستارۂ بسیار روشن
انگریزی تھر جو تھرس ڈے میں آتا ہے عربی طَرّ بمعنی ستارۂ روشن بہ تیزی اَس نشان یا شناخت اضافت
کے لئے آتا ہے۔

شکر

عربی شُقَرّ بوزن سُحَر کہ پرندہ ایست بمعنی ستارۂ بسیار روشن مثل آتش
زہرہ عربی بمعنی ستارۂ روشن۔
فرائے انگریزی عربی فَرَاع ستارۂ بلند وگرم و روشن

سنیچر یا سنشچر

سنیچر عربی میں سَنیج شَرّ ہے سنیج از سنج بمعنی روشن مائل بسیاہی اسی سے ہندی سنجھ و سانجھ بمعنی شام بنا ہے
شَر ستارہ روشن مثل شرار آتش و بدسنیج کی ج ی سے اور ش چ سے بدل کر سَنی چَر ہوگیا۔
بعض لوگ جو سَنشچر بولتے ہیں وہ سَنجش شَرّ ہے سَنج بمعنی روشنی سیاہی مائل۔ ش برائے اضافت
ج ی سے ش، چ سے بدل کر سَن یش چَرّ بنا لیتے ہیں بدی کی وجہ سے منحوس سمجھا جاتا ہے شین اضافت
کا عربی قاعدہ پہلے مضامین میں آچکا ہے۔
کیوان فارسی نام ہے عربی کا وان کا امالہ کیوان مادّہ کَو۔ سے ہے معنی ستارہ خرد و روشن مثل روزن خُرد۔
اس کی رنگت سیاہی مائل مشہور ہے۔ سنیچر کو ہندی میں تھاہ بھی کہتے ہیں جس کے سبب سے سنیچر والے دن
کو تھادر یعنی تھاہ وار بولا جاتا ہے وار بمعنی دن جو عربی میں دَہر بمعنی روز روشن ہے۔ تھاہ عربی طاس از طوس
بمعنی ستارۂ روشن سیاہی مائل کا مبدل و معرب ہے۔
سَیٹر انگریزی عربی سَطعَر از سطع مثل سَعبَر از سَعب۔ معنی سعب آب بسیار۔ سَعبَر چاہِ بسیار آب

سطح بمعنی ستارۂ بلند و روشن و خرد و تاریکی آمیز

اس کے بعد بروج فلکی کے سنسکرت نام حل کئے گئے جو حسب ذیل ہیں

عربی اور سنسکرت کے بالمقابل و مشابہ ناموں کے معانی میں تھوڑا تھوڑا فرق اس لئے ہُوا کہ ہر عربی لفظ کے اندر جو خواہ ایک ہی چیز کے کئی ناموں میں سے ایک ہو ایک جدا خصوصیت موجود ہے اور سنسکرت میں خصوصیتوں کی پرواہ نہیں ہے۔ ہر لفظ عام معنی میں بولا جاتا ہے جیسا سب عجمی زبانوں کا دستور ہے۔

عربی نام	معنی سنسکرت لفظ کے	سنسکرت لفظ	عربی لفظ	معنی عربی لفظ کے
حَمَل	بینڈھا	میکھ	میش	بُز ش کھ تبادل
ثور	بَیل	برکھ	ورک	ستور سواری
جوزا	جوڑا	متھن	مطوء	مردے کہ دوست خود را کہ نظارہ باشد ہمنشیں دارد
سرطان	کیکڑا	کرک	قرض	جانور آبی گیرندہ مثل مقراض با دو خار خمیدہ
اسد	شیر	سنگھ	صنق	شیر قوی و بدبو ق کھ تبادل (ص ک تبادل)
سُنبلہ	لڑکی	کَنیا	کَنیۃ	دختر دوشیزہ مستور از مرد
میزان	ترازو	تُلا	طُلاع	خبر دہندۂ اندازہ و مقدار بوزن غلام
عقرب	بچھو	برچھک	فرضخ	کژدم
قوس	کمان	دَھن	دَہنق	کمانِ نرم زہ سنسکرت دھن۔ دَھنک کا مخفف ہے جو دہنق سے مشابہ ہے۔
جدی	بکری	بکرا[1]	دیبکر مغز	
دلو	ڈول یا گھڑیا	کُنبھ	قم	لوپسند سرخ شیہ سبوئے آب کنبھ بھی سبوئے آب کو کہتے ہیں جس سے ڈول کا کام لیا جائے۔
حوت	مچھلی	مین	میعن	جانور ساکن آب رواں نفع بخش

[1] عربی میں جدی اسی برج کا نام ہے جسکو ہندی میں بکر کہتے ہیں مگر جدی عربی میں بزغالہ کو کہتے ہیں اور ہندی جنتریوں میں مکر کی تصویر مگرمچھ کے مانند ہے اس صورت میں مکر عربی بمعنی جانور آبی درندہ مثل شیر و حملہ کنندہ یعنی مگرمچھ ہے۔ آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کرکے ہر حصہ میں چند ستاروں کے ایک جھرمٹ کو کہ جسکا ہم صورت دوسری جگہ نظر نہ آئے انتخاب کرلیا۔ اور اسی جھرمٹ کے سب ستاروں میں خطوط مستقیم ملے ہوئے فرض کرنے سے جس چیز یا جانور کی شکل بنی وہی اُس برج کا نام رکھدیا۔ برج کے معنے حصے کے ہیں۔ اب جھرمٹ کے ستاروں میں سے کچھ چھوڑ دینے اور جھرمٹ میں چند متصلہ ستارے ملانے کے بعد تصویر بنانے میں فرق ہوجائیگا اسی وجہ سے عرب نے بکری کا بچہ اور ہندوں نے مگرمچھ بنا لیا۔

قیصری (باقی آئندہ)

فنِ تنقید

تنقید اس قدر وسیع موضوع ہے کہ اُس پر کافی بحث کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں اس وقت تک کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہیں جو اس ضروری علمی شعبہ کے مبادیات ہی پر روشنی ڈال سکے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ شبلی و حالی کے قدموں کی برکت سے اب قدیم تذکرہ نویسی و تقریظ گوئی کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر کچھ لوگوں نے علمی پیرایہ میں اس قسم کے مضامین لکھنے شروع کر دئے ہیں جن میں کسی شاعر کے کلام یا کسی مصنف کی تحریر کا صحیح موازنہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ورنہ آج سے دس بیس برس پہلے تو علمی محاکمہ کے صرف یہ معنی سمجھے جاتے تھے کہ یا تو مبالغہ آمیز تعریف کا طومار جمع کر دیا جائے۔ اور یا غلطیوں اور نقایص کا ایک انبار تیار کیا جائے جس کے نیچے کسی صاحبِ کمال کا جوہر اصلی دب کر خاک میں مل جائے۔ اس قسم کی تنقید کی اس سے زیادہ کوئی وقعت نہیں کہ وہ نقاد کی ذاتی رائے کا اظہار ہے۔ اور اگر وہ خود اربابِ بصیرت و ذوق میں سے ہے تو بسا اوقات اُس کی رائے دوسروں کی راہنمائی کا باعث ہوسکتی ہے۔ تاہم چونکہ ذاتی تعصبات سے کوئی خالی نہیں۔ اِس لئے تنقید کا یہ اسلوب اکثر حقیقت سے گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے۔ مولنا محمدُ حسین آزاد کے جو احسانات اردو زبان و ادب پر ہیں۔ اُن سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے زندۂ جاوید تذکرۂ آبحیات میں کہیں کہیں ذاتیات کی بناء پر فنِ تنقید کی دیانت کو کافی طور پر ملحوظ نہیں رکھا۔ علاوہ بریں اگرچہ اُن کے جادو نگار قلم نے یادِ رفتگان کو ایک زندہ محفل بنا دیا ہے۔ مگر جہاں تک اُردو شاعری کے ارتقاءِ ذاتی کا سوال ہے۔ اُن کا تذکرہ مثل سابقہ تذکروں کے اُس ارتقاء کے مختلف مدارج کوائف اور اُن کوائف کے مادی و روحانی اسباب بیان کرنے سے قاصر رہا ہے۔ شبلی و حالی کی نقادانہ تحریریں اس بارہ میں زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ اور جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ان بزرگوں کو مغربی علوم سے صرف دُور کی آشنائی تھی۔ تو اُن کے موازناتِ علمی کی قدر ہماری نگاہ میں اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شعر العجم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ حیاتِ سعدی اور دیباچۂ دیوانِ حالی۔ بلا شبہ

ایسی تصانیف ہیں کہ جن پر کسی زبان کو ناز ہو سکتا ہے۔ اور جو تنقیدِ علمی کے شاندار نمونے تصوّر کی جاسکتی ہیں +

اس تمہید کے بعد میرے مختصر مضمون میں صرف اتنی گنجایش ہے کہ فنِ تنقید کی ترقی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ جس سے ضمناً اُس کے بعض بنیادی اصول بھی معرضِ بحث میں آجائیں +

تنقید فطرتِ انسانی کے اُن اختراعات کو جانچنے کا پیرایہ ہے جو ادب اور فنونِ لطیفہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں + چونکہ اس وقت موضوع کو محدود کرنا مقصود ہے۔ اس لئے سطور ذیل میں صرف ادبی یا علمی تنقید کے تذکرہ پر اکتفاء کیا جائے گا + فنونِ لطیفہ کی تنقید بجائے خود ایک مستقل تحریر کی محتاج ہے۔ اور اُس کو موجودہ مضمون میں شامل کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا +

اس وقت جملہ علوم و فنون جو مغربی دنیا میں رائج ہیں۔ اُن میں سے سب نہیں تو اکثر یونانِ قدیم کے مرہونِ منت ہیں + فنِ تنقید کی بنا ڈالنے کا بھی فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے افلاطون کی جامع طبیعت نے اول اس فن کے اصول بیان کرنے کی طرف توجہ کی + لیکن افلاطون پر حکیم سقراط کی اخلاقی تعلیم کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے اُس نے ادبی خوبصورتی کا معیار حسنِ معنی کو قرار دیا۔ اور علمِ ادب کی صوری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا + یہ ظاہر ہے کہ علمِ ادب کی دو انواع ہیں۔ ایک وہ جو واقعات کے بیان پر اکتفا کرتی ہے اور دوسری وہ جو تخیلات اور تصوّرات پر منحصر ہے + قسمِ اول کی تنقید کے لئے ایسے نقاد کی ضرورت ہے کہ جو واقعات پر حاوی ہو۔ لیکن دوسری قسم کو جانچنے کے لئے شاعرانہ تخیّل درکار ہے +

علمِ ادب کی اس تقسیم سے یہ بھی واضح ہے کہ مخترعاتِ ادبی میں سے ہر ایک کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ نفسِ مضمون اور اُسلوب۔ قسمِ اول۔ نفسِ مضمون سے زیادہ علاقہ رکھتی ہے لیکن قسمِ دوم میں اسلوب اگر نفسِ مضمون سے زیادہ وقیع نہیں تو اُس کا ہم پلّہ ضرور ہوتا ہے + ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے جسے ہم اثر یا جذب کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں یعنی وہ صفت کہ جو محسوسات و تخیّل کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے + اخلاق کو نہ تو حسنِ صورت

سے بحث ہے۔ نہ لطفِ تخیل سے + وہ تو اُن صفات کا مجموعہ ہے۔ جو کائنات کے حقایق پر مبنی ہیں۔ اور جن کا مدار واقعات پر ہے + اس لئے یہ بات سمجھنی دشوار نہیں کہ حکیم افلاطون علمِ ادب میں واقفیت اور حقیقت پر کیوں مُصر تھا۔ اور سوز و گداز کی وقعت اُس کی نگاہ میں کس لئے کم تھی + مثال کے طور پر کوئی شعر لے لیجئے۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ خواہ کتنے اعلےٰ پایہ کا کیوں نہ ہو۔ اگر بندش (یعنی اُسلوب) سُست ہے۔ تو کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا + اور اگر دونوں باتیں موجود ہیں تو بھی ممکن ہے کہ اثر سے خالی ہو۔ اور حسنِ کلام کے انتہائی مقام کو نہ پہنچ سکے + لیکن افلاطون کے خیال میں اگر اُس کا مضمون حقیقت کے قریب ہے تو وہ اعلےٰ پایہ کا شعر ہے + شاید یہ کہنا اُس پر تہمت نہ ہوگا کہ اُس کی رائے کے مطابق پند نامہ سعدی دیوانِ حافظ سے بہتر ادبی نمونہ ہے + لیکن یہ ایسی رائے ہے کہ جس سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا +

افلاطون کے شاگردِ رشید ارسطو نے اپنے استاد کی اس کوتاہی کی تلافی کرنیکی کوشش کی۔ اور اپنی شہرہ آفاق تصنیف "بوطیقا" (پوئیٹکس) میں اُس نے اس مبحث پر طبع آزمائی کرتے ہُوئے یہ اعتراف کیا۔ کہ علم ادب کے لئے اُسلوب اور نفسِ مضمون دونوں یکساں طور پر لازمی ہیں۔ اور مضمون خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اگر طرزِ بیان دلکش نہیں تو اکتسابِ حسن سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا + علاوہ ازیں ارسطو نے سوز و گداز کو بھی کلام کا جوہر قرار دیا۔ اور قلبِ انسانی پر جو کیفیت دردناک مضامین سے طاری ہوتی ہے۔ اُس کے واضح کرنے میں بہت سازورِ قلم دکھایا + تاہم ارسطو نے بھی ادبیات کے اجزائے متخیلہ کی ترکیب کو کماحقہ نہیں سمجھا اور اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس کے زمانہ میں علم النفس کا مطالعہ اس قدر صحیح اور وسیع نہ تھا کہ تخیل اور اُس کے کرشموں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کر سکے +

زمانہ حال میں فنِ تنقید کو جو فوقیت حاصل ہے وہ تمام و کمال علم النفس کی تحقیق کا نتیجہ ہے + اس کا منشاء اُس کیفیت کو واضح کرنا ہے۔ جو خوبصورت کلام سے سامع کے دل پر وارد ہوتی ہے اور اُن اسباب کا یقین ہے کہ جو اس کیفیت کو پیدا کرتے ہیں + یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ عصرِ حاضرہ کی تنقید کو زیادہ تر ادب کے اُس تیسرے پہلو سے تعلق ہے کہ جسے

میں نے سطورِ بالا میں اثر یا جذب کے نام سے ذکر کیا تھا۔ نقاد کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی شاعر یا مصنف کے کلام کو اس نظر سے دیکھے کہ تخیل کو حرکت میں لانے کی اُس کو کہاں تک قدرت حاصل ہے۔ اور اُس کے تصورات ہمارے کون سے جذبات و محسوسات میں تموج پیدا کرتے ہیں۔ مضمون بجائے خود بلند ہو یا پست۔ انوکھا یا عامیانہ۔ اُسلوب فصیح ہو یا غیر فصیح۔ مشکل ہو یا آسان۔ لیکن اگر کلام میں یہ قوت ہے کہ ہمارے دماغ کو تصورات کا آماجگاہ بنا سکے۔ تو وہ قابلِ قدر ہے۔ ورنہ نہیں۔ یہ تو ضرور ہے کہ کمال تک پہنچنے کے لئے تینوں صفات کا مجموعہ لازمی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی تصنیف نفسِ مضمون اور اُسلوب دونوں کے لحاظ سے پسندیدہ ہو۔ لیکن اگر اُس میں یہ تیسری صفت مفقود ہے تو اُس کو اس زمانہ میں وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکتی جو خالی اثر یا جذب کی موجودگی سے نصیب ہو سکتی ہے۔ اس وقت بہت سے ایسے مصنف ہیں کہ جن کی شہرت صرف اس وجہ سے ہے کہ اُن کی تحریر پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری کر سکتی ہے۔ ورنہ اُن کے مضامین اکثر درجہ ثقاہت سے گرے ہوئے یا پیش پا افتادہ ہوتے ہیں۔ اور اُن کا اُسلوب بھی ان محاسن سے عاری ہوتا ہے۔ جو اکثر زمانوں اور مُلکوں میں تحریر کی زینت سمجھے جاتے ہیں۔ غرضیکہ افلاطون اگر ایک حد کو پہنچا ہوا تھا تو اس زمانہ کے معنی شناس دوسری حد کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ وہ علمِ ادب کی خوبی کو صرف اُن صفات پر محدود کرتا تھا۔ جو کائنات کے حقائق و معارف سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اور جو تمام عالم کے انسانوں میں مشترک ہیں۔ خلاف ازیں یہ لوگ اُس خوبی کو اُن صفات پر منحصر رکھتے ہیں۔ کہ جو مختلف آدمیوں پر مختلف کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اور جن کا معیار قائم کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اسکا ایک نتیجہ تو یہ ہوا ہے کہ علم ادب میں جدت پسندی اور خیال آفرینی کی طرف میلان زیادہ ہو گیا ہے لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہر ایک مصنف خود کو مطلق العنان تصور کرنے لگا ہے۔ اور کسی قاعدہ یا اصول کی پابندی کو خواہ وہ صرفی یا نحوی قاعدہ ہی کیوں نہ ہو اگر باعثِ عار نہیں تو کم از کم ایک قسم کی ناگوار قید ضرور سمجھا جاتا ہے۔ تاہم اس رجحانِ خیال کا تنقید پر یہ مفید اثر پڑا ہے کہ اب نقاد نکتہ چیں بننا مذموم شعار خیال کرتے ہیں۔ اور ہر ایک ادبی اختراع کو نظرِ وقعت سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نقاد کا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ادیب یا شاعر کے مفہوم تک اُس کے نقشِ قدم پر چل کر رسائی حاصل کرے۔ اگر وہ ادیب یا شاعر کسی غیر ملک یا دوسرے

زمانہ کا ہے۔ تو نقاد کو چاہئیے کہ ہر ایک شئے کو اُس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا سیکھے۔ اور اُس کے کلام کا اندازہ لگانے سے پیشتر اُن حالات و کوائف سے آگاہ ہونے کی کوشش کرے کہ جو اُس زمانہ و مُلک کے ساتھ مختص ہیں۔ غرضیکہ اب نقاد کی حیثیت ایک جج یا مجسٹریٹ کی سی نہیں کہ جس کے سامنے بے چارہ مصنف مجرمانہ حیثیت میں اپنی کوتاہیوں کی جوابدہی کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک طالب یا عقیدت مند کی حیثیت ہے جو مصنف سے فیض و استفادہ کا خواستگار ہوتا ہے۔ اور اُس کے ارشاد و راہنمائی سے اپنا مقصود حاصل کرنا چاہتا ہے ۔

محمد سعید

"ز - خ - ش" = (زاہدہ خاتون شروانیہ)

وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اُس کی قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کے ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے، یکایک خاموش ہوگئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، مگر عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت،

وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنے خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سُنائی دیتا ہے) سُنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں۔

اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوگوار ہیں کہ انکی مشاطۂ انکو دلآویز آرائیشوں میں اب پیش نہ کریگی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں جی، اور اُس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اُس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اُسکے صحنِ خانہ پر حسرت بار رہا، اُس نے فطرت کی زیبائیش، آفریدۂ دستِ انسان کی آرائیش نہ دیکھی، آفتاب جو دُنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے، تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گذر نہ سکا۔ لیکن خود اُس کے قلبِ منوّر نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمعِ تخیّل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلّی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشیں ز-خ-ش" کہا کی آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے۔

"خوش درخشید مگر شعلۂ مستعجل بود"

(یلدرم)

لحم خنزیر

ہندو شاستروں میں بھی جنگلی اور پروردہ سور کے گوشت کے متعلق ذکر ہے۔ عام خیال ہے کہ سور کا گوشت یعنی لحم خنزیر جو یہودیوں اور مسلمانوں میں حرام ہے ہندوؤں کے ہاں جائز ہے۔ اور اسی خیال پر عمل ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہندوؤں میں استعمال شاید ضد سے یا کسی اور وجہ سے شروع ہوگیا ہوگا ورنہ اگر شاستروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو شاستروں کی رُو سے یہ گوشت حلال نہ تھا۔ اس کا ذکر ہم آئندہ کرینگے *

ہم نے دو چار مسلمان بھائیوں سے دریافت کیا کہ اس خاص جانور کے گوشت سے منع کرنا کن وجوہات پر مبنی ہے؟ کسی نے کوئی کسی نے کوئی وجہ بیان کی لیکن ہم قائل نہ ہوئے آخر ایک وجہ ہمارے خیال میں آئی جو ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:-

ہندوؤں کے ہاں مچھ۔ کچھ اور دراہ اوتار گذرے ہیں یعنی بیان کیا گیا ہے کہ وشنوجی (جو خدا کا نام ہے) اِن تینوں شکلوں میں اس کرۂ ارض پر نمودار ہوئے ہیں۔ یعنی مچھلی کچھوے اور سور کی شکلوں میں۔ بعض لوگ ان باتوں کو لفظی طور پر صحیح مانتے ہیں بعض اہل علم اس بیان کو استعارہ سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ ازمنۂ طبقات الارض کے درجے ہیں۔ سور کی پیدائش سے گویا Mammalia (بچہ دینے والی) مخلوق ظہور میں آئی ہے۔ خیر اس سے تو بحث نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سور کا اوتار ہندوؤں میں ہوچکا ہے۔ سور کی شکل کے بت اس وقت جنوبی ہند کے مندروں میں موجود ہیں اور اُن کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ خیال صحیح سمجھنا چاہیئے کہ تجربہ۔ کراہت۔ عظمت یا عزت وغیرہ کے خیالات نے اہلِ مذہب کو حلال و حرام کے قرار دینے میں ضرور امداد دی ہوگی۔ گائے کا گوشت بوجہ عظمت کے منع ہے۔ بعض جانور مثلاً مردار خور۔ شکار خور جانور کراہت کی وجہ سے منع ہوئے ہونگے۔ اور بعض دوسرے مضرِ صحت ہونے کی وجہ سے منع ہونگے۔ چنانچہ شاستروں میں مچھلی اور کچھوا بھی جائز نہیں لیکن عمل اس امتناعی حکم پر نہیں رہا۔ علیٰ ہذا ہمارا خیال ہے کہ سور کا گوشت بھی اس وجہ سے منع ہوگا کہ اس شکل کو وشنوجی نے اوتار ہونے کے لئے اختیار کیا تھا۔

ورنہ ہماری عقل میں ایسا مقوی گوشت حضرتِ انسان کے دست برد سے کیسے بچ سکتا تھا؟

ایک کتاب موسوم بائبل ان انڈیا میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب ایک فرانسیسی لوئس جو کولیٹ نے لکھی تھی جو ایک انگریز نے ۱۸۶۹ء میں ترجمہ کی اور طبع ثانی پانِنی پریس الہ آباد سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ مصنف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض مقامات نہایت کامیابی کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ موسوی قانون ہندو قانون کی نقل ہے۔ ہمیں بعض مقابلہ کے حوالہ جات پڑھ کر تعجب ہوا۔ اور اگر وہ حوالجات صحیح ہیں تو کہیں کہیں تو بالکل نقل معلوم ہوتے ہیں اس مضمون میں اور باتوں کے ذکر کی گنجائش نہیں اتنا لکھنا کافی ہے کہ مصنف نے قوانین موسوی اور ہندو شاستروں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حلال و حرام کے متعلق دونوں قانون ایسے مشابہ ہیں کہ ان میں گویا خاندانی تعلق معلوم ہوتا ہے مشتاقِ تحقیقات اس کتاب کو خود پڑھ سکتا ہے۔ ہم یہاں ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں (صفحہ ۱۵۶)

"منو (Manu) اور دیگر برہمنی کتابوں میں ذکر ہے کہ اعلیٰ ذاتوں کو اُن چار پایوں کا گوشت نہ کھانا چاہیئے جن کے کھُر منقسم نہ ہوں اس حکم کا ایک استثنیٰ سور ہے گو اس کے کھُر کھٹے ہوئے ہیں یعنی ایک کھُر نہیں۔ یہ ممانعت پرورده سور کے متعلق ہے نہ کہ جنگلی سور کے یعنی سور کا گوشت حرام ہے"

سانکھ سنتھا صفحہ ۲۴۷

ایک سال کی تعزیری پراسچت اُس شخص کے لئے ہے جس نے پیاز۔ لہسن۔ کھمبہ۔ اونٹ۔ ہاتھی۔ چھپکلی۔ پرورده سور۔ یا مرغ کا گوشت کھالیا ہو۔

(نوٹ) اس حکم کی تعمیل کشمیری اور بعض برہمنوں اور دیگر اہل ہنود میں اس وقت تک جاری ہے۔ چنانچہ میری قوم کے لوگ مرغ۔ لہسن پیاز سے احتراز کرتے ہیں سور کا گوشت اُن کے گھروں میں نہیں پکتا گو اس کو ممنوع تصور نہیں کیا جاتا۔

وشسشت سنتھا صفحہ ۱۹۷ میں ذکر ہے کہ پورانوں میں جنگلی سور کے گوشت کے استعمال کے بارہ میں یعنی حلال یا حرام قرار دینے میں اختلاف رائے ہے:۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پرورده سور تو مسلّماً حرام تھا بعض نے جنگلی سور کو بھی حرام قرار دیا ہے

گوتم سنتھا صفحہ ۶۹۸

"گائے بیل اور سور کا گوشت ہرگز نہ کھانا چاہیئے"

یہاں پروردہ اور جنگلی سور کی تمیز نہیں کی گئی۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں گائے اور بیل کے گوشت کی ممانعت کی گئی ہے ان کے ساتھ ہی سور کا گوشت بھی منع ہُوا ہے۔ گویا امتناعی تاکید ایک ہی درجہ کی ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہندوؤں کے شارعان نے سور کا گوشت منع کرنے میں کوئی معقول وجہ دیکھی ہو۔ جو اس وقت دریافت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ تحقیقات صحیح ہے کہ ہندوستان کی تہذیب مصر اور شام تک پہنچی تھی تو کیا تعجب ہے کہ حضرت موسیٰ نے ایک مہذب قوم کے ممنوعات کو صحیح بنیاد پر مبنی سمجھ کر اُس کے مطابق حکم دیا ہو۔

راقم سطور کا واسطہ اس مضمون سے محض تاریخی تحقیقات تک ہے ورنہ جس شخص نے ہر قسم کا گوشت برسوں سے ترک کر دیا ہو اُس کے لئے ہر قسم کا گوشت حرام ہے۔

میری درخواست ہے کہ ناظرین میں سے کوئی صاحب اس سوال پر اور روشنی ڈالیں میں ہندوؤں کو خطاب کر کے کہتا ہوں کہ اگر وہ سور کا گوشت کھاتے ہیں تو وہ اپنے شاستروں کے مطابق نہیں کرتے آئندہ اُن کو اختیار ہے۔ درحقیقت اگر ساری دنیا ہر قسم کے گوشت کا استعمال ترک کر دے تو یہ تجربہ کسی نوع سے غیر مفید نہ ہوگا۔ مگر ذائقہ کی عادتیں جلدی نہیں بدلتیں۔

شمیم

شکریہ

ہم اپنے صاحبِ موقلم میاں عنایت اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر انڈسٹریل اسکول قصور کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے خاص ہُمایوں کیلئے یہ رنگین تصویر کھینچی ہے۔ امید ہے وہ آئندہ بھی اپنے رشحاتِ قلم سے ہُمایوں کی زیب و زینت کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

(د۔ ل)

عورت
اور
مختلف مذاہب
گذشتہ سے پیوستہ

اسلام یہی وہ دُنیا کا تنہا مذہب ہے، جس نے سب سے پہلے عورتوں کی حمایت میں آواز بلند کی، اور دفعتہً ان تمام مظالم کا خاتمہ کر دیا، جو ابتدائے تمدن سے اُن پر ہو رہے تھے،

اسلام کی سب سے زیادہ اہم اور شاندار تعلیم مساوات اور آزادی ہے، اسکے نزدیک مرد، عورت، امیر، غریب، جاہل، عالم، سب برابر ہیں، اس بنا پر مرد و عورت کی تفریق کو جو آغاز تمدن سے ہر مذہب میں چلی آتی تھی، اسلام نے بالکل مٹا دیا، اور سب سے پہلے دونوں کے فطری تعلق کا ان الفاظ میں اعلان کیا،

وَخَلَقَ لَکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا — اور تمہارے لئے خود تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کئے

لِتَسْکُنُوْا اِلَیْہَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً — تاکہ تم انکے پاس آرام پاؤ اور تم دونوں میں محبت اور پیار پیدا کیا

اس سے صاف طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کی تخلیق کا کیا مقصد قرار دیا، تم اوپر پڑھ آئے ہو، کہ دنیا کے اکثر مذاہب نے عورت کو صرف اسی نگاہ سے دیکھا ہے کہ وہ مرد کی غلام ہے، اس کو انسانی تہذیب و معاشرت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے، وہ مردوں کے احترام و محبت کی بالکل مستحق نہیں ہے، لیکن اسلام کے نزدیک وہ معاشرتِ انسانی کی جزوِ اعظم ہے، پولوس مقدس کے نزدیک عورت مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے، نہ کہ مرد عورت کے لئے، لیکن اسلام کی نگاہوں میں دونوں ایک دوسرے کے محتاج الیہ ہیں، دونوں کی حیثیت اور حقوق برابر درجہ کے ہیں،

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ — عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم انکا،

لَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ — عورتوں پر مردوں کے جو حقوق ہیں، اسی قسم کے حقوق انکے مردوں پر ہیں

روزانہ معاشرت میں عورتوں کے ساتھ جس محبت اور یگانگت سے پیش آنا چاہیئے، اس کی

تعیین اسلام نے ان مختصر الفاظ میں کی ہے،

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ — اور عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو،

اور تم پڑھ آئے ہو، کہ عیسائیت اور یہودیت کے نزدیک عورت کی کیا ہستی ہے، اب اسکے مقابلہ میں قرآن مجید کے ان شاندار الفاظ پر غور کرو،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا،

لوگو! اپنے خدا سے ڈرو جس نے تمکو نفس واحد سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں، اس خدا کی جس کی وجہ سے تم ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو، اور رحموں یعنی عورتوں کی عزت کرو، بے شک خدا تمہارا محافظ ہے،

ان الفاظ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت بالکل برابر ہیں، اور ایک دوسرے کے احترام ومحبت کی مستحق ہیں،

اولادکشی کی ظالمانہ رسم کو اسلام نے ان الفاظ میں مٹایا،

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ — اور اپنی اولاد کو قتل مت کرو،

عرب میں اسلام سے قبل لڑکیوں کو عموماً زندہ گاڑ دیا کرتے تھے، اس شرمناک رسم کو اسلام نے یہ کہہ کر مٹایا، اور اس طرح مٹایا کہ آج تک پھر کوئی واقعہ نہ ہو سکا،

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ — اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے قیامت میں سوال ہو گا کہ کس جرم پر وہ قتل کی گئی تھی،

عرب جاہلیت میں یہ عام دستور تھا، کہ جب کوئی شخص مر جاتا تھا، تو اس کے بھائی زبردستی اسکی بیوہ سے عقد کر لیتے تھے، یا اس کو نکاح سے باز رکھتے تھے، اور جب اس سے کچھ حاصل کر لیتے تھے، تو نکاح کی اجازت دیتے تھے، ان رسموں کا اسلام نے دفعتہً خاتمہ کر دیا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ — تم کو یہ جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کو وراثت میں لے لو، اور نہ یہ کہ انکو روکے رکھو تاکہ جو کچھ انکو مل چکا ہے اس میں سے کچھ لے لو،

مہر عموماً لڑکی کے باپ کو ملتا تھا، جس کے عوض وہ گویا لڑکی کو فروخت کر دیتا تھا، اسلام نے اسکو

قطعاً ممنوع قرار دیا، اور یہ کہا،

وَاٰتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً — اور دو عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے،

رومن لا کے نزدیک عورتوں کو جائداد میں کوئی ذاتی حق حاصل نہیں تھا، بلکہ وہ جو کچھ پیدا کرتی تھی شوہر کی ملکیت ہوتی تھی، اسلام نے اس جابرانہ قانون کا ان الفاظ میں خاتمہ کر دیا،

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ، — مرد جو کمائیں وہ ان کا ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ اُن کا ہے،

دیگر ممالک کی طرح عرب جاہلیت میں بھی عورت میراث سے محروم رہتی تھی، اسلام نے اسکے مقابلہ میں یہ کہا،

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ — والدین اور اعزہ کی وراثت میں مردوں کا حصہ ہے، اور

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ — اسی طرح والدین اور اعزہ کی وراثت میں عورتوں کا حصہ ہے،

اسلام کے نزدیک ہر شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، صرف عملِ صالح کی بنا پر نجات حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، — جو شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت عملِ صالح کرتا ہے، اور ایمان لاتا ہے، بے شبہ ہم اسکی زندگی کو خوشگوار بنائیں گے، اور جو عمل صالح کیا ہے، اس کا اجر ہم بے شبہ دینگے،

دُنیا میں کوئی مذہب قیامت تک اسلام کے اِس فخر کا حریف نہیں ہو سکتا، کہ اس نے آقا اور غلام کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا، اور غلاموں کو تمدنی حیثیت سے وہی حقوق عطا کئے، جو اور لوگوں کو حاصل تھے، چنانچہ قرآن مجید میں غلاموں کی شادی کے متعلق بالتصریح احکام موجود ہیں،

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ — اور شادی کر دو ان لوگوں سے جو تنہا ہیں اور ان مرد اور عورت غلاموں سے جو نیک ہوں، اگر وہ غریب ہیں تو خدا اپنے فضل سے انکو غنی کر دیگا، خدا بہت بڑا فیاض اور جاننے والا ہے،

بخلاف عیسائیت وغیرہ کے اسلام رہبانیت کا شدید ترین دشمن تھا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

رہبانیت کو عیسائیوں نے خود ایجاد کر لیا ہے، ہم نے بجز رضائے الہی کی جستجو کے اور کسی چیز کا انکے لئے حکم نہیں دیا تھا، اور جیسا چاہیئے تھا اس پر انہوں نے لحاظ نہیں کیا،

غرض ان تمام آیات سے یہ صاف طور پر ثابت ہے، کہ اسلام نے ہر حیثیت سے مرد اور عورت کو یکساں حقوق عطا کئے،

وراثت، مہر وغیرہ کے متعلق جو تفصیلی احکام قرآن مجید میں موجود ہیں، ان سے عام طور پر لوگ واقف ہیں، اس لئے طوالت کے خوف سے ہم انکو قلم انداز کرتے ہیں،

طلاق | تعلقات زن وشوہر کا ایک بڑا نازک مسئلہ طلاق ہے، جس کے متعلق دنیا کے اکثر مذاہب نے سکوت اختیار کیا ہے لیکن اسلام سب سے پہلا مذہب ہے، جس نے افراط و تفریط دونوں سے الگ ہو کر فطرتِ انسانی کے مطابق اصول و آئین مرتب کئے، جن کی صحت کو یورپ بھی روز بروز تسلیم کرتا جاتا ہے،

یہودیوں کے یہاں طلاق بات بات پر دی جا سکتی ہے، عیسائیت اس کو صرف خاص حالت میں ممکن قرار دیتی ہے، ہندو اس سے بالکل نا آشنا ہیں، اسلام بھی طلاق کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا، چنانچہ حضور سرور کائنات کا ارشاد ہے، کہ "جائز چیزوں میں خدا کی نگاہ میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے" لیکن چونکہ اسلام فطری مذہب ہے، اس لئے اس نے طلاق کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ یہ بہت ممکن ہے، کہ کسی وجہ سے زن و شوہر کے تعلقات خراب ہو جائیں، اور آپس میں تنغص اور کدورت پیدا ہو جائے، اس لئے ایسی حالت میں علیحدگی ناگزیر ہو جاتی ہے، یہ علیحدگی چونکہ اسلام کو ناگوار ہے، اس لئے اس نے اس کے لئے چند شرطیں ضروری قرار دی ہیں، جن سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے طلاق کو اسی حالت میں جائز رکھا ہے، جب کسی طرح شوہر اور بیوی میں اتفاق پیدا نہ ہو سکے،

ایسی حالت میں سب سے پہلے اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ

تو اگر تم انکو ناپسند کرو، تو یہ ہو سکتا ہے، کہ تمکو ایک چیز ناپسند ہو

اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا ۰ اور خدا اس میں بہت کچھ بھلائی پیدا کر دے،

وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِھَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا اَنْ یُّصْلِحَا بَیْنَھُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَیْرٌ ۰

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے ناراضی یا بیرخی کا ڈر ہو، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں صلح کر لیں، اور صلح اچھی چیز ہے،

اس کے بعد عورت کی تندمزاجی کی اصلاح کے لئے مختلف تدبیریں بتائی ہیں،

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا ۰

اور جن عورتوں کی نافرمانی کا تمکو خوف ہو، تو انکو نصیحت کرو، اور انکو چھوڑ دو انکی خوابگاہ میں، اور انکو مارو (خفیف طور پر) پھر اگر وہ کہا مان لیں، تو انکے خلاف حیلے نڈھونڈھو،

اس پر بھی اگر صلح و آشتی کی امید نہ ہو، تو قوم کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنا چاہیئے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے،

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا

اور اگر تمکو خوف ہو، کہ آپس میں ناراضگی ہو جائیگی تو ایک پنچ مرد کے گھرانے سے اور ایک عورت کے گھرانے سے مقرر کرو،

اگر یہ کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی اور مرد نے طلاق کا قطعی ارادہ کر لیا، تو اس مجبوری کی حالت میں اسلام نے طلاق کی اجازت دی ہے، لیکن اس پر بھی طلاق کا یہ طریقہ بتایا ہے، کہ تین مہینے میں بتدریج طلاق دی جائے، یعنی ہر مہینہ میں ایک طلاق، اس مدت کا اصلی مقصد یہ ہے، کہ ممکن ہے، کہ مرد اپنا ارادہ بدل دے،

لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ہر مرد نے اگر طلاق دیدی، تو مرد کو عورت کے ساتھ جو برتاؤ کرنا چاہیئے، اس کے متعلق قرآن مجید نے حسب ذیل حکم دیا ہے،

لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ وَلَا تُضَآرُّوْھُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْھِنَّ وَاِنْ کُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْھِنَّ حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَھُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَکُمْ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَیْنَکُمْ بِمَعْرُوْفٍ،

عدت کے زمانہ میں عورتوں کو انکے گھروں سے نہ نکالو، انکو رہنے کا مکان دو جہاں تم خود رہتے ہو اپنی مقدور کے موافق، اور انکو نقصان نہ پہنچاؤ دق کرنیکو، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو بچہ جننے تک انکو نان نفقہ دو، اور اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو ان کو اجرت دو اور آپس میں نیکی کے ساتھ معاملہ کرو،

اس کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی احکام ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے مطلقہ عورتوں کے حقوق کی کس حد تک نگہداشت کی ہے،

اس سلسلہ میں یہ بتادینا ضروری ہے، کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں صرف مرد کو طلاق کا اختیار حاصل ہے، لیکن اسلام نے علاوہ مرد کے عورت کو بھی حصولِ طلاق کا حق عطا کیا ہے، چنانچہ اس کو خلع کہتے ہیں،

تعددِ ازدواج اسلام کے متعلق یورپ کو جہاں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہاں ایک یہ بھی غلط فہمی ہے، کہ تعددِ ازدواج ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے، حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے،

اسلام سے قبل دُنیا میں جتنے مذاہب تھے، تقریباً سب میں تعددِ ازدواج کی رسم موجود تھی، عیسائیت میں کوئی خاص ممانعت نہ تھی، اگرچہ حضرتِ مسیح کی مخصوص تعلیم تجرد اور رہبانیت تھی، تاہم انکا کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے، جس سے تعددِ ازدواج کا عدم جواز ثابت ہوتا ہو، یہودی بھی اسکے مخالف نہ تھے، چنانچہ خود حضرتِ موسیٰ کے متعدد بیویاں تھیں، غرض اسلام جب آیا، تو تعددِ ازدواج کی رسم تمام دنیا میں موجود تھی، اس لئے اسلام کے لئے یہ کوئی جدید مسئلہ نہ تھا، لیکن اسلام سے قبل اس کے متعلق کوئی مخصوص اصول و آئین مرتب نہ تھے، اسلام نے بھی تعددِ ازدواج کی اجازت دی، لیکن چند شرطیں قائم کردیں، جو کسی مذہب میں موجود نہ تھیں،

تعددِ ازدواج کے متعلق قرآنِ مجید کی آیت حسب ذیل ہے،

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا،

اگر تم کو خوف ہو کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف نہیں کر سکتے، تو نکاح کرو عورتوں میں سے جو تمکو پسند ہوں، دو دو، تین تین چار چار، اور پھر اگر تمکو ڈر ہو کہ تم عدل نہیں کر سکتے تو نکاح کرو ایک سے یا ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں، یہ زیادہ مناسب ہے کہ صحیح راستہ سے منحرف نہ ہو،

پھر ایک دوسری آیت ہے،

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ

اور تمہاری طاقت سے باہر ہے، کہ تم عورتوں کے درمیان عدل قائم

وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ
رکھ سکو اگرچہ تم کو اس کی خواہش بھی ہو، لیکن بالکل بے توجہی کو راہ مت دو، تاکہ ایک کو بالکل مُعلق چھوڑ دو،

ان آیات قرآنی سے یہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے، کہ اسلام نے تعددِ ازدواج کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، جیسا کہ اکثر مخالفین یورپ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک مخصوص شرط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، یعنی صرف اسی حالت میں انسان ایک سے زائد نکاح کر سکتا ہے جب وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ مساویانہ حسنِ اخلاق سے پیش آ سکے، ورنہ وہ اسلام کے نزدیک مجرم قرار پائیگا، آیتِ ثانی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ اسلام تعددِ ازدواج کو اپنی کوئی مخصوص تعلیم قرار نہیں دیتا، کیونکہ تمام بیویوں سے مساویانہ برتاؤ عملاً مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لئے جہانتک ممکن ہو، انسان کو ایک ہی بیوی پر قناعت کرنی چاہیئے، غرض ان دونوں آیتوں سے یہ امر تحقق ہو جاتا ہے، کہ اسلام کا حقیقی منشاء وحدتِ ازدواج ہے،

لیکن چونکہ اسلام فطری مذہب ہے، اس لئے اس نے فطرتِ انسانی کی ہر حالت کا لحاظ رکھا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ خاص مواقع پر متعدد وجوہ مثلاً جنگ وغیرہ سے مردوں کی تعداد بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے، اس لئے ایسی صورت میں تعددِ ازدواج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اسلام نے اسی حالت کے لئے تعددِ ازدواج کا اصول قائم کیا ہے، چنانچہ خود وہ آیت جو تعددِ ازدواج کے متعلق ہے، جنگِ احد کے بعد نازل ہوئی ہے، جنگ احد میں بہت زیادہ مرد قتل ہو گئے تھے، اس لئے عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس بنا پر اسلام نے تعددِ ازدواج کی اجازت دی،

اسی کے ساتھ قیدیں بھی لگا دیں، تاکہ کوئی ناجائز فائدہ اُٹھایا نہ جا سکے،

بہر حال اسلام نے جنسِ لطیف کے حقوق کی جس حد تک نگہداشت کی، اور اس کو جس محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھا، اس کی مثال دُنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا،

مرزا احسان احمد بی۔ اے،

آرزُو

اِنسان خلاصۂ کائنات ہے۔ وسعتِ عالم کی تمام نیرنگیاں اس کے انوارِ سینہ کا عکس ہیں۔ یہ اجمال ہے۔ دُنیا۔ مافیہا وما وراہا اس کی تفصیل ہے۔ جو لوگ اس راز کے سمجھنے سے قاصر ہیں وہ مناظرِ موجودات پر ایک لمحہ کے لئے نظر دوڑائیں۔ پھر چشمِ بصیرت اپنے اندر وا کریں اور دیکھیں کہ قدرت کی ہر بیرونی نیرنگی کے بالمقابل اُن کے اندرونِ سینہ کوئی نہ کوئی لطیف جذبہ یا احساس ہے جس کی کیفیتِ اضطراری اُس نیرنگی سے علی الدّوام وابستگی پر مجبور ہے۔ اِسی مجبورِ جذبہ کا نام آرزُو ہے۔ اگر ہمارا علم اپنی تمام غائتوں کو پا سکتا اور پھر اس علم کے ساتھ ہمیں قدرت ہوتی کہ عالم کی نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف بوقلمونیوں کو گن سکیں۔ ساتھ ہی اپنے جذبات کی گوناگونی کا بھی اندازہ کر سکیں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ جس قدر قدرت میں نیرنگیاں ہیں اُسی قدر ہمارے دل کے اندر آرزوئیں اور حسرتیں ہیں۔

صانعِ مہربان نے اپنی محبوب ترین مخلوق کے سینہ میں جہاں آرزو جیسا درخشندہ جوہر پیدا کیا۔ وہاں اس جوہر کی ضو افگنی کے لئے وہ وسعتیں اور فضائیں تیار کیں کہ اگر وہ ابد تک چمکتا دمکتا رہے تو بھی ان فضاؤں کی حدوں کو نہ پا سکے۔ صورت ہے تو ایک سے ایک بڑھ کر۔ رنگ ہے۔ تو ایک سے ایک انوکھا۔ بُو ہے تو ایک سے ایک بھینی۔ غرض کیا کیا ہے اور کس کم و کیف میں نہ ہم شمار کر سکتے ہیں نہ یہ شمار کے احاطہ میں ہے۔ اگر مناظرِ ہستی شمار میں آ سکتے تو پھر ہستی مدتوں اس سے پہلے فنا ہو چکی ہوتی کیونکہ انسانی آرزوئیں مدت کی معدود و محدود ہو چکی ہوتیں۔

جو چیز دُنیا میں نیا منظر پیدا کرتی ہے یا ایک پنہاں منظر کو آشکارا کرتی ہے۔ وہ پہلوئے انسان کی نئی آرزو یا نئی آشکارا ہونے والی آرزُو ہے۔ اگر نئی آرزوئیں نہ اُٹھیں تو نئے مناظر بھی پیدا نہ ہوں (یاد رہے کہ لفظِ مناظر اپنے وسیع ترین معنوں میں یہاں استعمال ہُوا ہے۔ ناظرین کی نظر محض قدرتی مناظر تک نہ رہے۔ تمام مادی۔ عقلی۔ روحانی مقاصد لفظِ منظر کی تعریف میں شامل ہیں) منظر و آرزوئے منظر میں صرف حواسِ خمسۂ ظاہری ہی کا رشتہ نہیں۔ نہ حواسِ ظاہری کے اطمینان سے آرزو کا اطمینان مراد ہو سکتا ہے نگاہِ غور سے دیکھو تو آرزُو کا مقصد حصولِ منظر اور آرزُو کی تکمیل تصرّفِ منظر ہے۔ یہ بالکل

ممکن ہے کہ بعض مناظر کی دید یا شنید ہی آرزو کا مقصد ہو اور اُس کی تکمیل بھی۔ مگر یہ صرف مناظر کی بعض اقسام ہیں نہ سب۔

یہ تو قلبِ انسان کا قِصّہ ہے اور الم نشرح۔ حقیقت آشنا نظریں اور پتے دیتی ہیں۔ نہ صرف انسانی دل و دماغ ہی سے خواہشات و مقاصد ستلزم ہیں۔ بلکہ ہر جاندار و بے جان میں جو قوتِ عمل یا اُس کی ہیئتِ کذائی نظر آتی ہے۔ اہلِ بینش کی نگاہِ نکتہ آگاہ میں سب جوہرِ آرزو کا کرشمہ ہے اور اُس کی مادی نمود۔ علامۂ اقبال جنھوں نے ہم پریشان خاطروں کو سِرِّ آرزو سے ازسرِ نو روشناس کیا ہے۔ آرزو کے اس اعجاز کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یُوں بیان فرماتے ہیں :۔

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما　　　بست صورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیِ رفتار یافت　　　بلبل از سعیِ نوا منقار یافت
نے بروں از نیستاں آباد شد　　　نغمہ از زندانِ اُو آزاد شد

ہر چیز کی ہیئتِ کذائی اس کی باطنی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہی باطنی آرزو اصلِ زندگی ہے۔ زندگی جب مادہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اپنی بقا و حفاظت کے لئے طرح طرح کے اسباب و آلات وضع کرتی ہے۔ مذہب کی زبان میں یوں کہینگے۔ کہ وہ احسن الخالقین جب جوہرِ حیات کو مادہ میں ودیعت رکھتا ہے۔ تو اس جوہر میں وہ زور تابانی مخفی رکھ دیتا ہے جو اپنی خودنمائی میں اپنے لباس یعنی مادہ کو جس نشو و نما ہیئت و صورت میں چاہے بتدریج بدل دے۔ زندگی نے جس قوت و انداز سے مادہ کو احسن التقویم میں بدلا ہے۔ اور پھر آجتک اِس انتہائی و اعلےٰ پیکر سے بڑھ کر کسی اور احسن تر لباس میں جلوہ پیرا ہونے کی جستجو نہیں کی۔ اُسے اقبال کی کفایت نگاری نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے ۔

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش　　　فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت　　　بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت

عقل و جذبات جو بشر کے مایۂ امتیاز ہیں۔ سب کے سب زندگی یعنی حقیقتِ آرزو ہی کی نُدرت آفرینیوں کے مظاہر ہیں یہ ندرت آفرینیاں جو علوم و فنون۔ قوانین و مقاصد اختراع و ایجاد کرتی ہیں انہیں کی تنظیم و تنسیق سے عالمِ موجودات خاص قیام و نظام میں صورت گیر ہوتا ہے۔ زندگی کی یہ غیر مادی مخلوق اس کی تمام مادی مخلوق کی محافظ و مُصلح ہے۔ مگر جب تک عقل و جذبات اپنی جدّت

میں روزافزوں نہ ہوں۔ حفاظت و اصلاحِ مادہ میں تبدیل و تقلیب سے کام نہ لیں۔ نئے مقاصد و مناظر منصۂ شہود پر نہ لائیں۔ اُن کی ہستی معرضِ خطر میں پڑجاتی ہے۔ نہ صرف ان کی ہستی بلکہ وہ زندگی پژمردہ ہوکر مرجاتی ہے جس زندگی کا وہ حاصلِ ارتقا تھے۔ مگر عقل و جذبات کی تمام جدت طرازیاں خود آرزو کی نُدرت کوشیوں پر مبنی و موقوف ہیں۔ اگر آرزو میں نیرنگی ہے تو عقل و جذبات بھی نیرنگی دکھلانے پر مائل ہیں۔ اگر آرزو خوابیدہ ہوگئی ہے۔ تو عقل و جذبات کو پہلے مُردہ شمار کرو۔ عقل یا جذبہ کی ایک پرواز اگر تمہارے مقاصد کو عرش کی بلندی تک اُٹھا سکتی ہے تو ترکِ آرزو کی ایک جھٹک تمہارے عرش تک پہنچے ہُوئے مقاصد کو یکدفعہ زمین پر گرا سکتی ہے۔ بقول اقبال

نا اُمید از آرزوئے پیہم است — نا امیدی زندگانی را سم است

نا امیدی ہمچو گور افشاردت — گرچہ الوندی ز پا افشاردت

آدم کا خلد سے نکلنا ایک قصہ ہے جو لوگوں کی زبان پر ہے۔ مگر ایک حقیقت ہے جس سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک آرزو کے پُتلے کو جنت سی ازلی۔ ابدی۔ غیر منقلب و غیر متبدل جلوہ گاہ میں پیدا کرنا اور پھر وہاں آباد ہونے کا حکم دینا محض ایک بہانہ تھا اور ایک حکمت۔ خدا جانتا تھا کہ آدم کی آنکھ کھُلتے ہی اس کا جی ان مناظر پر للچائیگا۔ یہ جو کچھ دیکھیگا اس کے حصول کا خواہشمند ہوگا۔ جسے حاصل کرلیگا اُس پر تصرف کی سعی کریگا۔ مگر بغیر آدم کو جنت میں پیدا کرنے اور پھر اسے وہاں سے نکال کر زمین پر پھینکنے کے خود اس ہستی کو پیدا کرنے اور اُسے مامور کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ مصلحت میں نہ تھا۔ پیدا تو آدم کو دُنیا میں کرتے۔ مگر دُنیا کے مناظر جنت کے مناظر کے کب ہم پلّہ ہوسکتے تھے؟ مقصود یہ تھا کہ آدم کے سینے میں آرزوئیں تو مناظرِ جنت کی بھری جائیں۔ اور پھر دُنیا میں اُتارا جائے۔ تاکہ قیامت تک اگر مناظرِ ہستی ختم بھی ہوجائیں تو اس کی آرزوئیں ختم نہ ہوں ان میں جو تصرف کی حسرت ہے وہ نکل جائے تو پھر جب آدم ایک طوفانِ آرزو بن چکا آرزوئیں اپنی خامی سے پختگی تک پہنچ چکیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص دلکش منظر کے تصرف پر مائل ہُوا بلکہ تصرف کر ہی چکا تو حُکم دیا گیا کہ بس یہ مناظر تصرف کے لئے نہیں۔ تصرف کی خواہش کو پیدا کرنے کے لئے تھے۔ تیرے تصرفات کے لئے تیرے لئے اور جنت را دنے جنت یعنی دنیا تیار ہے۔ جاؤ۔ اس میں اپنی آرزوؤں کی طاقت کو آزماؤ۔ ان کو جولانیاں دے لو۔ تصرفات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔ ہماری شانِ خالقیت مقتضی تھی ایک کرشمہ جو کرشمہ پرور طلسم پیدا کیا جائے۔

جس سے ہماری ذات بے نیاز و مستغنی ہے۔ اسے تمہارے دل کے اندر رکھ کر اس کی نیرنگیوں کو آشکار کریں۔ اب تم اسے دل میں رکھو۔ دنیا کی جنت میں اس کے کرشمے دیکھو اور دکھاؤ۔ اعتدال میں رہو گے۔ "کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا" پر کاربند رہو گے تو یہ دُنیا تمہارے ہی لئے ہے اور تمہاری ہے۔ اسکی نعمتوں کو ہماری دی ہُوئی نعمتیں سمجھتے رہو گے تو یہ نعمتیں جتنی چاہو گے جتنی تلاش کرو گے اتنی بڑھتی جائیں گی۔ اور جب بالآخر تمام پا چکو گے۔ اور جب ہماری مشیئت ہو گی کہ یہ ختم کر دی جائے۔ اور دیکھ لینگے کہ تمہاری تصرف کی حسرتیں نکل چکی ہیں۔ تو پھر تم اُسی گھر میں جس سے نکالے جا رہے ہو آباد کر دیئے جاؤ گے۔ پھر کبھی ابد تک نہ یہاں سے نکلو گے اور نہ یہاں واپس آؤ گے +

معلوم ہُوا یہ دُنیا اسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس میں انسانی آرزوئیں اپنی نشوونما پائیں مناظر اپنے جلوے دکھائیں۔ ہر نئے دن نئی آرزو نئے مقصد سے ہم آغوش ہو۔ ہر سینہ ہجوم تمنا سے معمور ہو۔ دُنیا کا کوئی جلوہ۔ کوئی کرشمہ۔ کوئی مقصد۔ کوئی منظر ایسا نہ ہو جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ غرض ہر انسان پابندِ آرزو ہو۔

کوئے عشق است ہمہ دانہ و دام است اینجا جلوۂ مردمِ آزاد حرام است اینجا

آرزوئیں اُسی وقت تک زندہ رہ سکتی ہیں جب تک وہ نئے مقاصد پر مائل ہوتی رہیں۔ خود نئے مقاصد پیدا کرتی رہیں۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد آرزو کو نیا مقصد پیدا کرنا چاہیئے۔ نئی اُمید کی آگ انسانی دل کے اندر لگانا چاہیئے۔ نئے مدعاؤں کے مناظر اس کی آنکھ کے سامنے لانا چاہئیں۔ جب یہ ہوگا تو حواسِ ظاہری از خود آمادۂ کار ہونگے۔ زندگی ایک مسلسل جستجو بن جائیگی۔ مقاصد کے رستہ کی تمام رکاوٹیں بہ آسانی مغلوب ہو کر رکاوٹیں نہ رہینگی۔ بلکہ رستہ کے طے کرنے میں ممد و معاون ہونگی مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ اس کی اُن مقامات پر رسائی ہو گی جن کا پہلے اُس کے وہم میں آنا ناممکن تھا۔

آرزو بُری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بُری آرزو کا پیدا ہونا نفس کی کمزوری اور عقل کی خامی سے ہے ایسی آرزو کو آرزو نہیں کہیں گے۔ وہ حقیقت میں ترکِ آرزو ہے۔ کیونکہ صحیح و پاک آرزو سے بعید ہے۔

اتنی توضیحات کے بعد اب ہمیں یہ دکھانا ہوگا۔ کہ قوتِ آرزو نے دُنیا میں کیا کیا انقلاب پیدا کئے ہیں؟ انسان کی کن عالی مقاصد تک راہنمائی کی ہے۔ اور ضعفِ آرزو یا ترکِ آرزو نے کتنے

افراد کو زندہ درگور کیا ہے۔ کیسی درخشندہ ہستیوں کو قعرِ ظلمت میں پنہاں کر دیا ہے۔ کتنی اقوام اس کے ہاتھوں اپنے عروج سے گر کر ہمیشہ کے لئے سطحِ عالم سے روپوش ہو گئی ہیں۔ مسئلہ تنازع للبقا یا حفظِ خودی اب ایک عام مسئلہ ہے وہ تصوّف یا فلسفہ جو نفیِ وجود کے سبق دیتا تھا۔ ماسوا کے مقابلہ سے قاصر۔ جستجو و تصرّف کے کرشموں سے ناآشنا۔ علیحدگی و پستی کے گڑھوں میں سکون و راحت کی منزل کا پتہ دیتا تھا۔ اب عقلمند و بالغ نظر افراد و اقوام کی نگاہ میں مکروہ و باطل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال کی حقیقت شناسی و شعلہ نوائی نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اگرچہ ان کی ذہنی ترقی ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچی کہ کماحقہٗ اقبال کے "اسرار" و "رموز" کو سمجھ سکیں۔ تاہم انہیں یہ پتہ لگ گیا ہے کہ ہم وہ نہیں جو ہمیں ہونا چاہیئے تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک چنگاری اُن کے سینوں میں بھڑک اُٹھی ہے۔ کہ ہم وہ کب ہونگے؟ جو ہم تھے اور آج ہم کیوں وہ نہیں جو کل تھے؟

مضمون ایک دوسرے مستقل مبحث کی صورت اختیار کرنا چاہتا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ پرچہ میں اتنی گنجایش نہیں۔ اس لئے بالفعل اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔ اور پھر انشاء اللہ کسی دوسرے وقت اس کے باقیماندہ اور اہم ترین حصہ پر بحث کرونگا۔

ذوالفقار علی خاں

ناامیدی روح کے لئے موت ہے۔

رخنۂ حرص کو خاکِ گور ہی بند کر سکتی ہے۔

باطل کی حکومت چند لمحے قائم رہتی ہے اور سچائی کی قیامت تک۔

خدا سے ڈرو پھر تمکو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں

دانا دشمن نادان دوست سے بہتر ہے۔

اچھا ہمنشیں ایک نعمت ہے۔

غیر مستحق کو فائدہ پہنچانا ظلم ہے۔

ناجنس کی صحبت سے موت بہتر ہے۔

(حضرت علیؓ) تاجور

افسانہائے عشق

چاند نے کہا کہ :-

جُون کے مہینہ میں جبکہ ریگستان آتش وحیات سے متحرک ہوتا ہے، میں ایک رات اُس سنہرے ریت کے سمندر پر جس میں اہرام خوابیدہ ہیں، اُن ہلکے بادلوں میں جو نیلگوں آسمان پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، مصرِ علیا سے مصرِ سفلیٰ کی طرف پیرتا ہُوا جاتا ہوں۔ دریائے نیل کے سبزی مائل سُست خرام پانی کی سطحِ منّور پر، میرا چہرہ کنارے کی نمدار شادابیوں میں سے چھن چھن کر پھسلتا ہُوا نظر آتا ہے، اور میں خود اُس کی سیر کرتا ہوں۔

ہر سال، مقررہ رات کو تینوں اسی جگہ سے نکلتی ہیں جو خُرما کے درختوں کی شاخوں سے ڈھکی اور چھپی ہُوئی نیل کی ایک مخرمیت ہے اور جہاں وہ ہر سال غوطہ کھاکے غائب ہوجاتی ہیں۔ ہر سال اُسی رات کو اُسی مقام سے نکل کر تینوں اپنے افسانہائے عشق بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد، تینوں میری آخری شعاع کے ساتھ، سبزی مائل نیل میں ڈوب جاتی ہیں، اور اپنے مشتنٔےا جسموں کو دریا کے نیم گرم پانی کی آغوش میں ڈال کر، اپنے متفکر چہروں کو، اور اپنی مغموم اور مکدر آنکھوں کو جو اُن کے اضطراب آمیز عشقوں کا آئینہ ہوتی ہیں آسمان کی طرف متوجہ کئے ہُوئے، ماضی کی طرف جہاں سے آتی ہیں لوٹ جاتی ہیں ٭

---

(۱)

سب سے اول زلیخا نکلتی ہے اس کے سیاہ بال نہایت شاندار طریقہ سے گُندھے ہوتے ہیں، جن پر ایک سفید سادہ اوڑھنی پڑی ہوتی ہے، آنکھیں بڑی اور سیاہ ہیں جو اس طرح چمک رہی ہیں جیسے دو سیّال آفتاب اُس کی تمام حرکات ایک عمیق اور معنی دار مقدس بھجن کی طرح پُر آہنگ، متوازی اور سنجیدہ ہیں۔ وہ مصر کی سب سے پُرانی عاشقہ اور تمام عالمِ ماضی کی سب سے زیادہ حسین عورت ہے۔ اُس میں ایک ایسی پُرعظمت ادا ہے جو صرف اُن عورتوں میں پائی

جاتی ہے جن کا قلب سوائے ایک منتخب آتش کے شعلہ کے، ہر چیز کے لئے بند ہو چکا ہے، جو ایک یگانہ اور برگزیدہ عشق کی محشر زائیوں میں اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ سال میں ایک مرتبہ اس برکت دار اور حاصل خیز زمین پر جو اُس کی صحنۂ عشق و حیات رہ چکی ہے آتی ہے، اور اُس کے بازو، اور شانے سادہ مگر پُر ارماں حرکتِ حیات سے متحرک معلوم ہوتے ہیں، بولتے وقت، خرمے کے درختوں کی شاخوں کے نیچے، ہوائیں اوپر تلے آتی جاتی ہے۔ اور اُس کی عظمتِ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ زمین سے کسی زیادہ بڑے سیارہ کی ملکہ ہے، اُس کی آوازیں گہرے، صمیمی اور درد انگیز نغمے بھرے ہوتے ہیں، وہ کہتی ہے +

"اے ارضِ مقدس! جس نے میری روح کو آتش و حرارت میں مبتلا پیدا کیا ہے۔ اے تیرے پُر فیض، حیات و فراوانی بخش سینہ پر تیری حقیقی بیٹی پھر آئی۔ جس طرح تو اپنے سینے، اور اپنے دل کی گہرائیوں میں سے آخری قطرۂ محبت و فیض کسی کو دینے سے دریغ نہیں کرتی، لیکن خاموش رہتی ہے، میں بھی اپنے عشق کے درد و سوز کے بیان کرنے اور اس تصویر میں رنگ بھرنے سے احتراز کروں گی، مگر کیا یہ بھی نہ کہوں کہ تیری حقیقی اولاد یوسف نے ہی، میری اس عصمت و وقار کے باوجود، میری روح میں یہ آگ بھڑکائی تھی۔ وہ جب اس دنیا میں تھا، اس وقت جس طرح میرا دل اپنی منفرد اور پوری قابلیتِ جوش کے ساتھ، اُس پیارے چہرے کے لئے تڑپتا تھا، اب بھی اسی طرح تڑپتا ہے +

تو اپنے فیض کو، اپنی ٹھنڈی اور بیجان برکت کو آخری دم تک اپنی اولاد کو بخشے گی، میں، تیری سچی بیٹی زلیخا بھی ابد تک اپنی روح کے آخری شعلے، آخری حرارت کو اُسی کے لئے محفوظ رکھوں گی،،

اپنے ایمانِ عشق کی اس طرح صمیمیتِ روح سے تکرار کر کے وہ اپنے لمبے اور شاندار بازوؤں کو اس نمناک و پُر فیض زمین کی طرف اس طرح بڑھاتی ہے گویا اُس سے لپٹنا چاہتی ہے اس کی تقدیس کرتی ہے اور آخر کار اُن سبز ہلکی موجوں میں جو اُسے اپنی شیریں آغوشِ شرف میں لینا چاہتی ہیں ڈوب کر چلی جاتی ہے +

زمین

یری اور

(۲)

اس کے بعد، کلیوپیٹرا اپنے تمام طنطنۂ احتشام، اپنی تمام شان وشوکت کے ساتھ نکلتی ہے وہ اُس سج دھج سے آتی ہے جو اُس نے اپنے آخری سپاہی عاشق کو دکھائی تھی، اُس عاشق کو جس نے اُس کے متلون اور ہرجائی دل کو موہ لیا تھا،

سواری کا بجرہ سونے کا ہے، چپّو چاندی کے ہیں، بادباں ریشم کے، جن میں سے وہ معطر خوشبوئیں نکل رہی ہیں جو لذیذ آرزؤں سے ہوا کو بھی مست کر رہی ہیں۔ خود زرتار تکیوں سے کمر لگائے اپنی حسرت اور ارمانوں کو لئے دعوت کار، طلبگار لیٹی ہے۔ اُس کے نازک نرم جسم کی ادنے حرکت میں لطیف اشارات احتراص پیدا ہوتے ہیں جنہیں بلیغ موسیقی سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے اور نہیں سمجھا سکتی۔ اُس کے سانولے نازک چہرے کے گرد، اُس کے چمکیلے اور نرم بال، اک ادائے تسلیمیت سے اپنی پوری رونق کے ساتھ پڑے ہوئے، ایک دل آویز تصویر کا چوکھٹا بنے ہوئے ہیں اس کی دلکش پیشانی میں، اس کی مخمور آنکھوں میں، اُن ہونٹوں میں جس کی ہر جنبش میں اک داستانِ عشق پنہاں ہے، اُس کے حسین جسم کے ہر عضو میں، غمِ الفت۔ دیوانگیٔ محبت، ابتلا ومظفریت، جلوے دکھاتی ہیں۔ اس عورت کا سیما، اس عورت کی روح نامنتہا ہی ہے۔ اس کی زندگی ایک مدید لمحۂ حرص رہی ہے۔ جس میں وہ ہر آن ایک نئے جلوے اک نئی روح سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس وقت کہ اُس کا بجرہ نیل پر تیرتا ہوا جا رہا ہے، اُس کے چہرے کے گرد، ہزار ہا روحیں جنہوں نے اس کے عشق کے عذاب اُٹھائے ہیں، اب بھی اُن عذابوں سے آتش زیر پا، مگر پروانہ وار چکر لگا رہی ہیں۔ ان پروانوں میں کون کون ہے؟ بڑے سنجیدہ دماغ والے، عقلمند لوگ ہیں جو اُس کی متلون مزاجی، کبھی متواضع، کبھی مغرور اداؤں کے شکار ہو چکے ہیں، بڑے بڑے با اختیار، محتشم شاہنشاہ ہیں، یہ اُس حسن کی کشش میں کھنچے چلے آئے ہیں جسے وہ زہرہ سے مانگ کر لائی ہے، یہ بچارے سب کے سب وہ اسیر ہیں جنہوں نے تھوڑی دیر کے رنج اور وجد کے بدلے میں اُس کے بیدرد ہاتھوں سے زہر کے پیالے پئے اور نیل میں ڈبوئے گئے۔

ماننا چاہیئے کہ اس تماشاگاہِ عالم میں وہ ایک بڑی ایکٹرس تھی، جو عشق کا کھیل کھیلنے بلکہ عشق کی زندگی بسر کرنے ہی کو آئی تھی،

مگر آج کی رات، جبکہ جون کی گرمی میں ریگستان آتشِ حیات سے متحرک ہے، اور وہ زمین پر اپنا پرانا فسانۂ عشق بیان کرنے آئی ہے، اُس کا ایک بھید ہے جسے میں ہی سمجھتا ہوں اور دنیا میں کوئی نہیں سمجھتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بظاہر ظالم عورت، ایک کمزور عورت ہے جو تمام عمر عشق کے ہاتھوں ستائی گئی، وہ ایک ملکہ ہے جس کی تمناؤں کا اتنا خون ہُوا، کہ وہ ایک سانپ سے موت کی بھکاری ہوئی۔ وہ بہت کم باتیں کرتی ہے، مگر اس کے اوضاع، اس کی حرکات سے کیا کیا نہیں ٹپکتا۔ مثلاً جس وقت وہ اپنے آخری عذابِ الیم کو دوبارہ اس زمین پر بیان کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اپنے ہاتھ کو نیل کی کیچڑ میں ڈالتی ہے، وہاں اُسے ایک چھوٹا سا سانپ ملتا ہے جسے وہ باہر نکال لاتی ہے، اور اُسے اپنے سینے پر رکھتی ہے۔ پھر اپنے عبا کو اپنے اوپر ڈال لیتی ہے، اور اُس جسم کو جو موت میں بھی ایک طرف قیصر و کسرے کی شان یاد دلاتا تھا، اور ایک طرف ایک پھول ایک ستارہ، یعنی ایک عورت کا جسم تھا اُس شاہانہ لباس سے ڈھک لیتی ہے اور نیل کے سبزی مائل پانی میں جو اپنے شیریں آغوش میں اُسے لینے کے لئے منتظر ہے، اپنے تئیں ڈال کے غائب ہو جاتی ہے۔

(۳)

سب سے آخر میں، ہیپاشیا سبز موجوں کے پردے کو ہٹا کر یکایک نیل کے کنارے نکلتی ہے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے، سر ہاتھوں میں لئے ستارے کی طرح روشن۔ آنکھوں کی نمدار نظریں نیل کی طرف کئے ہوئے وہ بڑی دیر تک نیل سے رازِ دل کہتی ہے۔ میں اس حسین و متفکر چہرے کو بہت پیار کرتا ہوں، ایک زمانہ تھا کہ اسکندریہ، مرمر کی سفید عمارتوں، کتب خانوں، عجائب خانوں اور باغوں سے اک شہرِ مخیّل جیسا دلربا شہر بنا ہوا تھا۔ اور وہ کاندھوں پر نرم ریشمی عبا ڈالے، پاؤں میں خوبصورت چپلیاں پہنے اس شہر میں مصروفِ خرام تھی، دماغ میں نفیس افکار، عالی فلسفے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی روح کی طرح اس کا جسم بھی باکرہ عصمت مآب تھا، اور اس عصمت کے خطِ تکبر سے متکبر رہتا تھا۔ اس ملک میں جس نے اپنے سنگِ مرمر کے سوا، ہر چیز کو میلا اور لکہ دار کر دیا تھا، صرف ہیپاشیا کی روح پاک و صاف تھی، اُس کے افکار، اُس کے خیالات، اس کی نظریں اس قدر زمین سے علیحدہ، اس قدر گردوں پیما تھیں، کہ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کوئی سرابِ فلکی ہے۔ میری اور

اُس کی شناسائی اسی زمانے سے ہے، میں جس وقت اسکندریہ کے اوپر سے گذرا کرتا تھا، وہ اپنی پاک اور خوبصورت آنکھوں پر دُوربین لگاکر مجھے گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ اور پھر پاپیرس کاغذ پر عجیب خطوں سے کچھ لکھا کرتی تھی۔ حسبِ معمول میں ایک رات، اسکندریہ سے گذر رہا تھا، اور حسبِ معمول میں نے اس کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے اُس کا گھر خالی پایا۔ آج زلیخا و کلیوپیٹرا کے بعد جو وہ نکلی تو میں نے اُس سے پُوچھا کہ کرۂ خاک سے وہ کیوں روپوش ہوگئی؟ اس نے اپنے پیارے سر کو جو یونان کی عقل و حکمت کی دیوی اتینا کا تجلی گاہ بنا ہُوا تھا میری طرف اُٹھایا اور اُس یاس سے جو تمام علما و کملائے دہر کو دنیا سے رہی ہے، اُس نے مجھ سے کہا:۔

"میں نے انسانوں کو قعرِ مذلّت میں سے نکالنے اور اُبھارنے کی کیا کیا جدوجہد نہ کی۔ اے پیارے چاند! تو اس کا شاہد ہے۔ انسان، جس وحشت و بہیمیت میں مبتلا ہے، وہ نظّارہ اپنی دل خوں کن تجلیوں میں میری آنکھوں کے سامنے تھا، مگر میں اُس وقت اُس پاک و علوی خواب کو دوبارہ دیکھ رہی تھی جو افلاطوں کی بزرگ روح نے انسانوں کے لئے دیکھا تھا، میں چاہتی تھی کہ سب انسان، آنکھ، روح اور فکر کے ذریعہ، پروردۂ حُسن و خوبی ہوں۔ نیچر کی خوبصورتی، صنعت کی خوبصورتی، اُن کے چاروں طرف تبسّم ریز ہو، اور اُن کے دماغ حُسنِ سماوی کی طرف بالا پرواز ہوں۔ میں چاہتی تھی، کہ انسان کے قوائے ذہنیہ علم کے زیور سے آراستہ ہوکر (کہ قوائے ذہنیہ ہی انسان کی بلند ترین تجلی ہیں) مادّہ اور جسم کی سفلیت و تاریکی پر غالب ہوں آہ! اس کے لئے میں نے کیسی کیسی کوششیں کیں، مگر ہُوا کیا؟ اِدھر اُس مونسِ روحانی مسیحا کی امت جو انسان کو بچانے کے لئے آیا تھا، انسانوں کو عذاب و شکنجہ میں کھینچ کھینچ کر، فکر اور دماغ کو تعصب و جہالت سے بھر بھر کے تاریک کر رہی تھی، اور ظالم و خونخوار بن کر میرے پاک خواب کو برباد، اور میرے تمام مجاہدے کے مقابل میں دیوارِ آہن استادہ کر رہی تھی اُدھر، روما کے بیمار و کثیف بچے، اور پھر مال کے وحشی میرے رویائے علمی، میرے خوابِ ارتقاء و نجاتِ انسان کو، اپنے دنی اور ذلیل حرکات سے پراگندہ و پریشاں کر رہے تھے۔ آخر ایک دن آیا کہ ان ہزاروں جنس والے، ہزاروں مذہب والے انسانوں کے انبوہ میں پیروانِ عیسےٰ بھی ظاہر ہُوئے؟ ان حضرات کے تشریف لانے کے نتیجے سے، پیارے چاند! تم بیخبر نہیں ہو؟

یہ کہتے وقت اپنے حسین جسم کی پوری قابلیتِ عظمت کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اپنے کندھوں کو اونچا کرتی ہے، اور ایک لطیف وقار کے ساتھ جو اولمپا کے حسین اور بلند مرتبہ دیوتاؤں سے حاصل کیا گیا معلوم ہوتا تھا، اپنے سر کو آسمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

یہ پیروانِ عیسیٰ آئے اور اُس خونخوار درندوں کے غول کی طرح جو خون پینے کے لئے کسی کے پیچھے جھپٹ رہا ہو، مجھے اپنے کلیسا تک گھسیٹ لے گئے۔ اور اپنے بے گناہ عیسیٰ کی تصویر کے نیچے جو مغموم مگر روحانی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی، مجھے ذبح کیا اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے مجھے تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مگر میرے دماغ کے تخیلات کے ستارے، اب بھی مرتفع، اب بھی ضیا بار، اب بھی آسمانِ ابدیت میں درخشندہ ہیں اور رہیں گے"

اُس نے جب یہ دلدوز تقریر ختم کی، تو اُس سوز و گداز کے ساتھ، جو زلیخا اور کلیوپیٹرا کے ماجرائے عشق نے مجھ میں پیدا کر دیا تھا، میں نے اُس سے پوچھا:-

"پیاری لڑکی، یہ تو بتا کہ تیرے روحانی اور بے داغ جسم کو کبھی بشری خطاؤں کا دھبہ تو نہیں لگا؟"

اُس نے اپنی نُور فشاں مگر خیال پرست نظروں سے میرے دل کی گہرائیوں تک کو چھید ڈالا، جس نے مجھے بتایا کہ جس طرح اُس کی رُوح، فضائے لاہوتی میں اپنے سفید پروں سے پرّاں ہے، اسی طرح بشری کمزوریوں کے بھنور، خطاؤں کی گہرائیوں میں بھی پھڑ پھڑا چکی ہے۔ مگر میں ان رازوں کو جن سے دنیا بے خبر رہی ہے کبھی زبان پر نہیں لا سکتا کیا اُس نے بھی، ہر انسان کی طرح محبت کے عذاب جھیلے، تاریکیوں میں ٹھوکر کھائی شعلوں میں گری یا نہیں گری؟ اسے صرف ہیپاشیا کی روح جانتی ہے یا میں۔

وہ جب ہر سال اپنا فسانہ اپنی آنکھوں سے مجھے سُناتی ہے، میں سفید اور سنہرے بادلوں میں سے نکل کر، اور اپنی زرد اور ٹھنڈی شعاعیں اُس کے محبوب چہرے، اور اُس کے باکرہ جسم پر ڈال کر، شفقت و نوازش سے اُس کے بوسے لیتا ہوں، اُس کی تقدیس کرتا ہوں، آخر کار وہ بھی، اُن دونوں کی طرح، سبز پانی کی شیریں اور منتظر آغوش میں اپنے تئیں ڈال دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔

(خالدہ خانم ادیب) سید سجاد حیدر

خیالات

جس نے عُسرت کا مُنہ نہ دیکھا۔ وہ زندگی کی حقیقت سے ناآشنا رہا! جس کی آنکھیں غم کے آنسوؤں سے لبریز نہ ہُوئیں اُس نے دریائے دل میں پانی کے مدوجزر کا نظارہ نہ کیا!

خوشیاں اے ہمدم! دلکش و دلفریب ہیں اور غم جانگداز، لیکن وہ سراب آفریں ہوتی ہیں اور یہ عکس ریز! اُن سے راہ چلنے والے رستہ بُھول جاتے ہیں اور یہ بُرے وقت میں بھی بھُولے ہُوؤں کی رہنمائی کرتا ہے!

رنج وافکار اضطراب انگیز ہوتے ہیں اور عشرت ساکن، لیکن جوہڑ میں پانی کثیف ہوتا ہے اور بہتی ہُوئی ندی میں لطیف و پاکیزہ!

سمندر میں طوفان اُٹھتا ہے تو خوابیدہ پانیوں میں شدّت کی بے قراری پیدا ہو جاتی ہے لیکن بحرِ ناپیدا کنار کی عصمت وعفت فقط اِسی بے کلی پر موقوف ہے!

بادل گرج کر جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے لیکن تیرہ و تار جنگل میں تنہا مسافر کا رستہ اُسی سے مُنوّر ہے!

دُنیا میں کوئی وجود نہیں جس کے نفس میں گاہے گاہے بے چینی پیدا نہ ہو اور کامل سکون تو زندگی کے لئے عین موت ہے؟

اے تُو جو سر بفلک محلوں میں متمکّن ہو کر اپنے نادار بھائیوں پر غلط انداز نظریں ڈالتا ہے نہیں سمجھتا کہ خس و خاشاک کے جھونپڑے میں رہنے والا مزدور اپنے خدا کے زیادہ قریب ہے اُس نے تنگی کے سینکڑوں دن کاٹے ہیں اور اپنے بال بچوں کی فکر میں اُس کی اکثر راتیں بیداری میں گذری ہیں!

وہ جس کی وزنی جیب میں سونے چاندی کے سکّے جھنکار پیدا کر رہے ہیں کیونکر جان سکتا ہے کہ سُوکھی روٹی اور ٹھنڈے پانی کے گھونٹ میں کس نعمتِ خداوندی کی شیرینیاں چھپی ہیں اُسے کیا معلوم کہ ننھے بچّے کی مطمئن مُسکراہٹ میں کسی ضیاء نورانی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں!

اے بدبخت جس کی قسمت میں دُنیا بھر کی راحتیں لکھی ہیں اور کاوش کچھ نہیں اگر چاہتا ہے کہ جسمانی آسایش کو اطمینانِ قلبی کے بدلے کھودے اور جیتے جی موت کی خوشیاں حاصل کرے تو اپنے لاکھ کے گھر کو خاک میں ملا دے اور قدرت کی بے نیازی سے اپنی فطرت کو مالامال ہوجانے دے؟ وہ کم مایہ جس کو تُو نے ابھی حقارت کی نظر سے دیکھا ہے جب کڑی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر اُس کے دو آنسو ٹپکتے ہیں تو اس آزاد روشی پر فرشتوں کا دل پسیجا ہے؟ تُو دُنیا سے کُوچ کریگا تو ساز و سامان کے ساتھ دفن ہوگا اور چند ساعتیں اخباری یا کاروباری دُنیا میں تیرے اُٹھ جانے کا خشک تذکرہ ہوگا لیکن وہ جان دیگا تو شانِ کریمی ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ اُس کے استقبال کو آئیگی اور پھُولوں کے اک مطمئن کنج باغ میں اُس کا مسکن ہوگا اور یہ اس لئے کہ تُو عمر بھر اَوروں سے مُنہ پھیر کر فقط اپنے نفس کی پرورش میں منہمک رہا لیکن اُس کی جان نے زندگی کے سارے دُکھ خود سہے اور کسی دل کو ایذا نہ دی!!

بہارِ خزاں ہوجاتی ہے۔ دن ڈھل جاتا ہے، شام چھا جاتی ہے! اور
بقا صرف خدا کی ذات کو ہے!!

پرندے چہکتے ہیں اور خاموش ہوجاتے ہیں، پھُول کھِلتے ہیں اور مُرجھا جاتے ہیں، لہریں سمندر میں اُٹھتی ہیں پھر بہ جاتی ہیں، سُورج نُور کے تڑکے رُونما ہوتا ہے پھر شام ہوتے اُفق میں چھپ جاتا ہے اور
بقا صرف خدا ہی کی ذات کو ہے!!

ہم پیدا ہوتے ہیں، ہمارا بچپن کھیل کُود میں گذرتا ہے اور ہماری جوانی عیش و عشرت میں صرف ہوتی ہے۔ ہم مال و دولت کے جھگڑوں میں غرق ہوجاتے ہیں اور بال بچّوں کے بکھیڑے میں پڑکر سمجھتے ہیں کہ اب تو ہماری زندگی اَوروں کے لئے بھی لابدی ہے لیکن بڑھاپا آتا ہے تو رُوح خود بخود موت کے آگے سرنگوں ہوجاتی ہے کیونکہ وہ جان لیتی ہے کہ
بقا صرف خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے!!

بشیر احمد

محفلِ ادب

ابونصر فارابی معلّمِ ثانی۔ اگرچہ ابونصر سے پہلے مسلمانوں کو یونانی فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ارسطو کی نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کو ایک دوسری زبان درکار تھی۔ قدرت کے اسرار ایک ترجمان کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اُس وقت یونانی فلسفہ عربی میں نہایت بھدّے اور ناموزوں ترجموں کے لباس میں تھا۔ بے جان الفاظ کے پیکروں میں روحِ معانی کے جلوے تصّور کو بھی نظر نہ آتے تھے کہ یہ ناموروجود خاکِ پاک پارس سے اُٹھا۔ اور حقائقِ اشیاء کے اظہار کا چمکتا ہُوا آفتاب تمام عالمِ افکار میں روشن کر دیا۔ جس کی کرنیں عرب وعجم بلکہ یورپ وامریکہ کے فلاسفروں کے خلوت کدۂ تخیل میں پہنچ گئیں۔ ارسطو نے گو افلاطوں کی طرح تعلیمِ فلسفہ کے لئے اپنی ہیکل کے دروازہ پر یہ نہیں لکھ دیا تھا کہ "جو علمِ ہندسہ نہ جانتا ہو ہمارے پاس نہ آئے" لیکن اُس کا تسلسلِ خیالات اور مقدماتِ تمہیدیہ کا سلسلہ بھی فہم وخرد میں ابھی نہ آنے پاتا تھا کہ مخاطب کثرتِ غور وخوض سے مجنوں ہو جاتا تھا۔ ابونصر نے ارسطو کی کتابوں پر کثرت سے تعلیقات لکھے، اُس کے مجمل بیانوں کی تشریح اور مترجمین کے اغلاط کی تصحیح کر دی۔ جس سے عربی خزانۂ افکار میں یونانی جواہر کی قدر وقیمت بڑھ گئی۔ یونانی فلسفہ عام ہو گیا۔ اور عام وخاص اُس سے مستفید ہونے لگے،، (عبرت)

"انسان کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جگ بیتی کی سننے میں اُسے بڑا لطف آتا ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ اسکی اپنی زندگی ہی کیا کم ہے؟ اپنی ہی معاشرت اور میل ملاپ کے روزانہ مشاہدے اُس کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاید اس کے مزاج میں ایک عجب عیّاری اور شوقِ جستجو ہے۔ وہ اپنے تجربوں کو نہایت سستے داموں مول لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کی تقلید کی خواہش ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ اور اُن کی زندگی ایسی پراسرار وعجیب معلوم ہوتی ہے کہ اپنے مشاہدات خواہ کتنے ہی

دلچسپ و نتیجہ خیز ہوں مگر مقابلتاً کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قصّوں اور کہانیوں کے پڑھنے یا سُننے میں اسے ایک خاص قسم کا ذوق وشوق ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کو پُورا کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تلقین خواہ کتنی ہی مصنوعی و مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو مگر اُس کے وہم و تخیل کی تسکین کے لئے کافی ہے اور اُس کی سمجھ کے موافق اُس کے علم میں بھی اضافہ کرتی ہے اور دلبستگی کا باعث بھی ہوتی ہے،،

(اُردو)

مہاراجہ اشوک۔ اشوک گو بدھ مذہب کا پکّا معتقد تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب کے معتقدوں کو بالکل ایذا نہیں دیتا تھا۔ اُس کے بعض احکام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ برہمنوں جینیوں۔ اور سادھوؤں کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک فرمان میں صاف طور پر لکھا ہے کہ راجہ تمام مذاہب کے لوگوں کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اُن کو انعام و اکرام دینا پسند کرتا ہے۔ اسی فرمان میں یہ بھی ذکر ہے۔ کہ راجہ مذہبی تعصّب کو ہرگز پسند نہیں کرتا، اور اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کے معتقدوں کے ساتھ درشتی یا سختی سے پیش آئے۔

(شباب اُردو)

نیویارک (امریکہ) کا ایک تاجرِ کتب حال ہی میں تمام یورپ کی سیاحت کے بعد لندن پہنچا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ امریکہ میں اب تک جو کتاب نہایت سُرعت اور عمدگی سے فروخت ہوئی ہے وہ "مین سٹریٹ" تھی جس کے دو لاکھ نسخے بہت جلد فروخت ہو گئے۔ مگر تاجرِ موصوف بیان کرتا ہے کہ جب وہ برلن میں تھا تو ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی کتب کے شائع کنندگاں نے ڈاکٹر موصوف کی تصانیف کو شایع کرنے کے لئے بیس لاکھ پونڈ سے زیادہ کا غذ کا آرڈر دیا تاکہ کتب شایع کی جائیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس لاکھ پونڈ سے تیس لاکھ کتب شایع ہو سکیں گی،،

(زمانہ)

تنقید ہو یا تنقیض۔ خود اپنی ہی حقیقتِ ادراک اور ذوق طبیعت کا انکشاف ہے انگلستان کا مشہور فلاسفر روکے اب سے ساٹھ سال پہلے کہہ گیا ہے۔

بعض اوقات کسی نقاد کی خامہ فرسائی مبحث پر اتنی روشنی نہیں ڈالتی۔ جس قدر خود اپنے دل و دماغ کی کارگذاری پر۔ ایسی حالت میں موضوعِ بحث محض ایک آئینہ ہوتا ہے۔ اور بحث نقاد کی ذات کا عکس"

تنقید۔ خواہ وہ کسی ادیب کے متعلق ہو۔ سب سے پہلے نقاد پر ایک تنقید ہوتی ہے۔ نقاد جس طرح دوسروں کی حقیقت کا مفسر ہے۔ اسی طرح خود اپنے جوہرِ قابلیت کا آئینہ دار ہے۔"

(مخزن)

ڈاکٹر فرینک کرین۔ کانفرنس برائے تخدیدِ اسلحہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ جب تک انسانی نفس۔ یا ذہن غیر مسلح نہ ہوگا جسم کو غیر مسلح کرنا بیکار ثابت ہوگا۔

"اگر قومیں بحری و بری طاقتوں کو غیر مسلح کردیں گی تو اس سے کیا حاصل ہوگا اگر ہماری رُوحیں بارود سے بھری رہیں اور ہمارے خیالات توپوں کی چمک سے روشن ہوں +

تمام مادی اشیاء رُوحانی کیفیات کی مظہر ہیں۔ اور مشکل یہ ہے کہ ہم ایک ایسے دل کے ساتھ دُنیا میں زندگی گذارتے ہیں جس کے خیالات گویا تیر و تفنگ اور چاقو اور بندوق کی تیزی تندی سے ہم آغوش رہتے ہیں + اگر ہم صلح اور خوشحالی چاہتے ہیں۔ اگر ہم دُنیا کے گلی کوچوں میں امن و سکون دیکھنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو غیر مسلح کرنا پڑیگا +

وہ ذہنی اسلحہ کیا ہیں منافرت، خود پسندی، انتقام، بے اعتمادی۔ یہ باتیں خواہ کسی قوم میں ہوں یا کسی فرد میں، دائمی صلح کے لئے ان کا ترک کرنا لازم ہے!

(ماڈرن ریویو)

مغلیہ حکومت کی بنیاد زورِ شمشیر پر نہ تھی۔ یہ بات قطعی ناممکن تھی کہ اتنے بڑے برِّ اعظم میں جہاں لاکھوں قصبے اور دیہات دُور دُور تک پھیلے پڑے تھے زورِ شمشیر سے حکومت کی جاتی + علاوہ بریں قرونِ وسطیٰ میں حکومت کی تواعد دان فوج اور لوگوں کے اک جمِ غفیر میں اتنا فرق نہ تھا جتنا آج کل نظر آتا ہے۔ اُن مادی زبردستی کا نتیجہ زبردستی ہوتا تھا اور زبردستی کی حکومت بہت

نہ چل سکتی تھی۔ مغلوں کا ڈیڑھ سو برس تک اپنی سلطنت قائم رکھنا زورِ شمشیر کی وجہ سے نہ تھا۔ اُس کی بنیاد مذہب یا زورِ قوت یا کسی مخصوص جماعت کی امداد پر نہ تھی۔ سترھویں صدی کی مُغلیہ حکومت عوام الناس کی حقیقی رضامندی سے نشوونما پاتی تھی + مذہبی آزادی اس تسلیم ورضا کی پہلی شرط تھی + دوسری وجہ معاشرتی زندگی کی مکمل آزادی تھی اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ہر گاؤں کی حکومت اپنے قدیم دستور کے مطابق گاؤں والوں کی مرضی پر چھوڑ دی گئی تھی +

(ماڈرن ریویو)

عراق اور علم وادب۔ معاصر "العراق" (بغداد) عراق عرب میں دورِ جدید کی برکات کی فہرست بیان کرتا ہُوا اسطورِ ذیل میں اہل علم وادب کی مساعی کا ذکر کرتا ہے:۔

"ادبائے عصر نے جب دیکھا کہ عربی ادب انحطاط پذیر حالت میں ہے، عراق عرب کے تاریخی وقار کو دیکھتے ہُوئے یہ ادبی انحطاط افسوسناک ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ عراق میں ایسے گرانقدر ادیبوں اور عالیجاہ سحرطرازوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی ذراسی توجہ سے ادبِ عربی کو زمین سے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا سکتے ہیں، جو ادبیات کو عصرِ حاضر کے مناسب جدید سانچے میں ڈھال کر جدت واختراع کی رنگینیوں سے روح فروز بنا سکتے ہیں صرف اس بات کی کمی ہے کہ اہل ادب "اشتراک عمل" کے اصول پر کاربند ہو کر مل کر کام کرنے کے خوگر ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کمی کو محسوس کرتے ہُوئے چند اصول عمل بنا کر اپنی ادبی کوششیں شروع کردی ہیں۔

اسی طرح علمائے کرام نے تعلیم کے فقدان اور اُس کے خطرناک نتائج۔ جہالت کے عموم اور اس کے مہیب انجام کو دیکھا۔ اور سمجھ لیا کہ اہلِ وطن کا نعمت علم سے دیر تک محروم رہنا تباہی کا موجب ہو گا اس تکلیف دہ احساس سے متاثر ہو کر انہوں نے اہلِ علم کی ایک جمعیتہ کے انعقاد کو ناگزیر تصور کرتے ہُوئے "المعہد العلمی" کا افتتاح کر کے اطراف و جوانب میں اس کے انعقاد کا اعلان کر دیا تاکہ اہلِ وطن اس میں داخل ہو کر بہرہ اندوز ہوں۔

العراق　(بغداد)

قدرتی شاعر وہ ہے۔ جو روزمرہ کی باتوں کو نہایت دلکش الفاظ میں لوگوں کے سامنے ایسی صحت وصفائی کے ساتھ پیش کرے۔ کہ وہ انہیں فوراً سمجھ سکیں۔ وہ شیریں لیکن حقیقی امور کا ایک ایسا چشمہ بہائے جس کے کنارے آکر حساس لوگ عاشق مزاج شیاما کے زمزمے سنیں۔ حسین پھولوں کی خوشبو سونگھیں۔ معصوم تیتریوں کا رقص دیکھیں۔ اور دو چار گھنٹے کی تفریح کے بعد رخصت ہو جائیں۔ جسے سمجھنے کے لئے گھنٹوں پریشاں ہونا پڑے اور لغات کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ وہ شاعری نہیں ہے۔ شاعر معمولی الفاظ لے کر اُن سے اک حسین دُنیا تعمیر کر دیتا ہے ~~~ وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے شاعری وہ ہے جسے سُن کر آدمی بے اختیار کہہ اُٹھے۔ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب کہنے لگے تو دماغ پریشان ہو جائے۔

پربھا (ہندی)

آرٹ کا مخزن قدرت کی لامحدود خوبصورتی ہے۔ لیکن آرٹ قدرت کا ممکن نہیں بلکہ انسانی دل کی اندرونی خوبصورتی کا بیرونی اظہار ہے۔ والٹ وہٹمین نے اپنی ایک کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے۔ Comerads, this is no book Who touches this touches a man

یعنی اے دوست! یہ کتاب نہیں۔ جو اسے چھوتا ہے وہ گویا اس کے مصنف کو چھوتا ہے۔ آرٹ کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے اشعار میں اپنی روح بھر دیتا ہے۔ اُسی طرح مصور اپنی تصاویر میں اپنی روح نکال کر رکھ دیتا ہے۔ ہر ایک آرٹسٹ کے دل میں قدرت کی خوبصورتی کی جو دل آویز تصویر منقش ہے۔ اُسی کو وہ اپنے اظہارِ کمال کے موقعہ پر دنیا دی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ شاعری اُسی کی زبان ہے، موسیقی اُسی کی تان ہے۔ مصوّری اُسی کا عکس ہے۔ جسے اپنے دل کی گہرائیوں میں اس خوبصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فنِ لطیفہ میں ناکام رہتا ہے۔ وہ ڈھانچہ کھڑا کر سکتا ہے۔ کہ یہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ لیکن اُس میں موزونیت اور شعریت پیدا نہیں کر سکتا جو اُس ڈھانچے کی جان ہے۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک اُس کے دل

میں خوبصورتی کا ظہور نہ ہو۔ جس کا دل حسن کی تجلیوں سے محروم ہے۔ اُس کا اظہارِ کمال ہمیشہ نا مکمل رہتا ہے۔ اور دُنیائے صیغۂ فنون میں یہی سب سے بڑا نقص ہے ﴿ سرسوتی (ہندی)

دین و دُنیا۔ "دُنیا دین کی آزمایش کرتی ہے۔ دین۔ دنیا میں انسان کو ترقی دیتا ہے بعض اصحاب ایسے ہیں جو دین کماتے ہیں۔ بعض دنیا میں محو ہو جاتے ہیں۔ مبارک وہ ہیں جو دونوں کو انکی مناسب جگہ دیتے ہیں۔ اور دین و دنیا دونوں میں ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ دین و دنیا دونوں دو علیحدہ چیزیں ہیں لیکن ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔ ان کا اتحاد انسانی تہذیب کا منتہائے مقصود ہے ﴿

رسالہ گجراتی[1] پونا (گجراتی)

محبت۔ ایسے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو دیانت داری سے جانتے۔ مانتے۔ اور محسوس کرتے ہیں۔ کہ عورت اور مرد میں محبت نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ وہ خاوند بیوی نہ ہوں۔ یا بدچلن یا قریبی رشتہ دار نہ ہوں۔ یہ خیال تہذیب اور سوسائٹی دونوں کی بدترین توہین ہے۔ دُنیا میں سب سے پاکیزہ اور بلند ترین محبت وہ ہے۔ جو خون شریک رشتے، خاوند بیوی کے تعلّق، اور ناپاک جذبات سے قطعی بے نیاز ہو ـــــــ مہذب ممالک اس پر فخر و ناز کرتے ہیں۔

بھارتی[2] (بنگالی)

تاجور

---

[1] یہ گجراتی زبان کا بلند پایہ رسالہ پونا سے ماہوار شائع ہوتا ہے

[2] بنگالی زبان کا یہ منتخب ماہوار ادبی رسالہ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کی ہمشیرہ سورن کماری دیوی کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے ﴿

لغات الجاہلین (والعارفین)

انسان ۔ ایک پتہ جو زندگی کی شاخ میں لگتا ہے۔ اس پتے سے ایک کلی پھوٹتی ہے (بچپن)۔ کلی پھول بن جاتی ہے (شباب) پھول جھڑ کر پھل لاتا ہے (پیری) پھر یہ پھل پختہ ہو کر جوئے موت میں گر پڑتا ہے جو اُسے ہمیشگی کے سمندر میں لے جاتی ہے + ڈ ب

اک بزرگ جو ارتقائی پھلانگیں لگاتے لگاتے اپنا قومی نشان (دم) کھو بیٹھے۔ (تاجور)

بستر ۔ وہ سرائے جہاں ہر شخص رات کے وقت آکر ٹھیرتا ہے + ڈ ب

تعلیم ۔ عقل مارنے کا ذریعہ۔ جس سے ڈینگ مارنا سیکھا جاتا ہے۔ دستخط کر سکنے کا فن + ڈ ب

تعلیم ۔ موجودہ ہندوستان میں ایک عجوبہ زا مشغلہ۔ جواب سے دو سال پیشتر ہر ہندوستانی کے لئے "دین و ایمان" سے زیادہ ضروری تھا۔ لیکن اب نوجوانوں کے لئے زہر قاتل۔ روح سوز غلام ساز یہ اور وہ اور خدا جانے کیا کیا! اس پر طرہ یہ کہ صنف نازکتر (اسکول کے بچوں) کو جب تک وہ اسکول میں ہوں یہ زہر قاتل ضرر رساں نہیں۔ (تاجور)

تدبیر ۔ انسان کی گستاخی خدا کے آگے۔ ہاتھ پاؤں مارنا۔ عقل کو زنگ لگنے سے بچالینا۔ تقدیر کے بٹیر سے اپنا بٹیر لڑا دینا۔ خدا کی دی ہوئی طاقت کا استعمال + ڈ ب

تقدیر کی بیوی۔ (تاجور)

ٹائی ۔ ایک مروڑا ہوا کپڑا جو اشارہ کرتا ہے کہ پہننے والا پھانسی دئے جانے کے قابل ہے

چاند ۔ تاروں کا دلبر۔ چاندی کی ایک طشتری جس میں رات سورج کی کرنیں رکھ کر زمین کے آگے پیش کرتی ہے + ڈ ب

چاندنی ۔ چاند کی محبت بھری نگاہیں۔ محبت کی بولی۔ ایک سوئی ہوئی حسینہ جس کے چہرے کی جھلک تاریکی کو اپنی ہلکی ہلکی کرنوں سے منور کر دیتی ہے

حجام ۔ جس کی مدد سے افریقہ کا حبشی یورپ کا جنٹلمین بن سکتا ہے + ڈ ب

سر تراش (تاجور)

خدا - وہ ترازو جس میں کائنات کی قوتیں تلتی رہتی ہیں + ایک ان دیکھی ہستی جو کائنات میں قدرت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے + جس نے لاکھوں کروڑوں ہستیوں کے جوڑے جوڑے بنا دیئے اور پھر خود اکیلا رہ گیا + جس کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ پوشیدہ ہے +

وہ سب سے زیادہ شرمیلی ہستی جس نے کائنات کا پردہ اپنے چہرے پر ڈال لیا ہے ب

دوا - انسانوں کے ایک فرقے کی ایجاد جس کی گذران اسی پر ہے۔ دوا کھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہو بلکہ صرف یہ کہ اُس کا کسی ڈاکٹر سے تعلق پیدا ہو جائے ب

دوا (اگر اشتہاری ہو تو) ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی کی گپھا میں رہنے والے ایک خدا رسیدہ سنیاسی کی عطا کردہ "جیون بوٹی" ایک ایسے شخص کو جو پریس ایکٹ کی زد میں آنے والے امراض سے تنگ آکر خودکشی پر آمادہ تھا۔ لیکن اس "جیون بوٹی" کی ایک ہی خوراک سے ایسا بھوت سر پر سوار ہوا کہ کانجی ہاؤس میں بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ تاجور

(ڈاکٹری ہو تو) کونین اور دودھ چاول جو تین سو ساٹھ مرضوں کے لئے مفید ہے۔

(یونانی ہو تو) گل بنفشہ ۶ ماشہ، گاؤزبان ۶ ماشہ، عناب ۵ عدد، مویز منقی ۲ دانہ، کاسنی ۶ ماشہ، بیخ کاسنی ہمرا ۶ ماشہ

کوفتہ بیختہ جوشاندہ خیساندہ ساختہ ہمراہ عرق بادیان بخورند

دنیا کی خطرناک طور پر بڑھتی ہوئی مردم شماری کی روک تھام کے لئے یہ مرکب دوا بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ (تاجور)

س سائنس - نجات پانے کی نئی مشین جو چلانے والے کو پیس ڈالتی ہے + وہ علم جس سے خدا کی قدرت ثابت ہوتی ہے لیکن جو اپنے جاننے والے کو خدا سے منحرف کر دیتی ہے + ب

شاعر - تمام سادہ چیزوں میں رنگ بھرنے والا جس کا دل غم و انبساط کی انتہائی کیفیتوں سے لبریز رہتا ہے۔ قافیہ کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا شخص۔ ایک وہمی آدمی جو کام کی بات کہتا ہے کرتا نہیں + ب

الآدم = "معمول" شیطان۔ الشاعر = مکار الملک (مکار بہ معنے بھروپیا) جنٹلمین = نواب بے ملک

اڈیٹر = شاکی نامہ نگاران۔ تقدیر = عذرِ کاہل الوجودی۔ لیڈر = ابن الوقت۔

محمد عثمان خاں۔ ایل۔ ایم۔ ایس۔

یادِ ایّام

پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے مُبارک عہد میں ایک معزز قبیلہ کی کسی عورت نے چوری کی اور وہ چوری معتبر شہادت سے ثابت بھی ہوگئی پیغمبرؐ اسلام نے حسب قانونِ شرع اُسکا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ یہ عورت اک بڑے قبیلہ سے تھی اس بنا پر بڑے بڑے لوگ اس کے سفارشی ہُوئے۔ پیغمبرِ اسلام کو اُس پر بہت طیش آیا۔ اور آپ نے اِن سفارشوں کو رد کرتے ہُوئے فرمایا کہ" قانونِ خداوندی میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ خدا کے حدود سب کے ساتھ مساوی ہیں۔ پہلی امتیں اسی لئے برباد ہوگئیں کہ لوگوں نے غریبوں ہی کے لئے تمام قانون نافذ کئے اور امرا کا گروہ ان قوانین کی زد سے بچایا جاتا رہا قسم ہے اُس خدائے برتر کی جس کے قبضے میں محمّدؐ کی جان ہے اگر محمّدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس جرم میں اس کا ہاتھ بھی اسی طرح کاٹا جائیگا"۔ (تاریخ الاسلام)

خلفائے اسلام رعایا کے معمولی افراد کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ عام لوگوں کی طرح بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جاتے اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاکر نماز پڑھتے تھے۔ بیت المال کی خود اپنے مال سے زیادہ حفاظت کرتے تھے اور اس پر بھی کہتے تھے کہ

"قیامت کے دن خلافت کی ذمہ داریوں سے ہم اگر بلا عذاب اور بلا ثواب نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے"۔ (عہد بنی امیہ میں مدینۃ اسلام)

امیر المومنین عمرؓ ابن عبدالعزیز کے عہد امارت میں تموّل کی اس قدر کثرت تھی کہ لوگ اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر تلاش میں نکلتے تھے اور کوئی صدقہ لینے والا فقیر دستیاب نہ ہوتا تھا۔

عہدِ اسلام میں والیٔ کوفہ نے اعلان کر دیا تھا کہ جس قدر مال چوری جائے وہ مجھ سے آکر وصول کرلے اس عہد میں خود کوفہ میں (جو اُس وقت شورشوں کا مرکز تھا) کوئی شخص رات کو بھی اپنے مکان یا دکان کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا (تاجور)

بزمِ تحقیق

ہر زبان کی شاعری میں شاعر کا ایک مخاطب ہوتا ہے جس کی خیالی صورت پیشِ نظر رکھ کر شاعر جذبات آرائی کی مشق کیا کرتا ہے۔ ہندی زبان کی شاعری میں شاعر عورت ہو یا مرد اپنے آپکو عورت فرض کر کے اپنے محبوب مخاطب کو مرد تصور کرتا ہے۔

عربی میں شاعر مرد ہو تو عورت کو مخاطب بناتا ہے اور عورت ہو تو مرد کو فارسی کے صیغوں میں تذکیر و تانیث کا چونکہ کوئی امتیاز نہیں اس لئے شاعر کا مخاطب مرد ہو یا عورت صیغہ ایک ہی مستعمل ہوگا۔ اردو کے صیغے فارسی کی طرح تذکیر و تانیث سے ساکت نہیں ہیں اس لئے اردو شاعری پر یہ اعتراض ہمیشہ ہوتا رہیگا کہ اس کے مخاطِب (شاعر) اور مخاطب دونوں مرد ہوتے ہیں۔ فارسی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ "مجالس العشاق" کی ناطق شہادت اور اس قسم کے جذبات

("ز لشکر برفت و آں بتِ لشکر شکن برفت　　ہرگز مباد کس کہ دہد دل بہ لشکری")

کی موجودگی میں بھی فارسی شاعری محض اپنے صیغوں کی پردہ داری کے سبب چشم نمائی سے محفوظ ہے۔ لیکن اردو کے پاس یہ سہارا بھی نہ تھا اس لئے یہ ہدفِ ملامت بنگئی۔ اہلِ لکھنؤ نے چوٹی اور مانگ کے مضامین نظم کر کے فطرت نگاری کی بنیاد رکھنی چاہی تھی مگر وہ اس جرم میں اردو دنیا کے آجتک معتوب ہیں۔ میری رائے ناقص میں ضرورت ہے کہ اردو شاعری کا طریقہ خطاب عربی کے مطابق بنا کر اردو شاعری کو اس ناقابلِ رشک حالت سے نکالا جائے تھوڑے سے ایثار کی ضرورت ہے مستند سخن طراز پہل کریں تو کچھ دنوں کے بعد باقی شعراء انکے نقش قدم پر چلنے لگینگے۔

۲

اردو شاعری کے رواج سے پہلے ملک میں بھاشا کے دوہرے۔ چوبولے وغیرہ رائج تھے۔ ولی دکنی نے جہاں بھاشا میں فارسی تراکیب، استعارے، اور فارسی مضامین داخل کر کے اسے اردو بنایا وہاں اُس نے بلا ضرورت اُردو نظم کے لئے فارسی اوزان و بحور بھی اختیار کر لئے۔ فارسی اوزان و بحور ایران کی شاعری کے لئے مناسب ہو سکتے ہیں۔ اُردو شاعری تو انکی وجہ سے گرانبار پابندیوں میں دب گئی۔ فطری سادگی جو کسی زبان میں ہو سکتی ہے اُس سے اُردو محروم ہے۔ میر تقی مرحوم نے اپنی غزلیات میں جہاں بھاشا کے اوزان میں سخن سرائی کی ہے فطری جذبات کی تصویر کھینچکر رکھ دی ہے۔ سخن طراز حضرات جانتے ہیں کہ بعض وقت اُردو نظم کی غیر طبعی پابندیوں کی وجہ سے بہتر سے بہتر شعر کاٹ دینا پڑتا ہے۔ اگر یہ غیر ملکی پابندیاں حائل نہ ہوتیں تو آج اُردو نظم میں ہر قسم کے مضامین کا بیکران ذخیرہ موجود ہوتا۔ تو کیا اساتذۂ فن اس سوال پر اپنی توجہ مبذول فرمائینگے؟ اُردو شاعری اگر بھاشا کے طبعی اوزان میں ڈھلنے لگی تو اسکی ترقی کے راستہ سے رکاوٹوں کا ایک ہمالیہ ہٹ جائیگا۔ اس میں تو ایثار کی بھی ضرورت نہیں صرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔

تاجور

حصۂ نظم

خاموشی

ذیل کے گرانپایہ اشعار ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر اقبال کے خامۂ جواہر چکاں کی تراوش ہیں۔ یہ اشعار علامۂ موصوف نے چاندنی رات میں دریائے ٹینکر (ہائڈلبرگ جرمنی) کے کنارے موزوں فرمائے تھے۔ "تاجور"

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
فطرت ہے مراقبے میں گویا
وادی کے صدا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
تاروں کا خموش کاروان ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
ٹینکر کا خرام بھی سکوں ہے
اے دل خاموش تو بھی ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

(غیر مطبوعہ) اقبال

کلامِ اکبر

خلقت کی مصلحت سے بہم کچھ یہ پیار ہے
ورنہ ہر ایک اپنی طرف بے قرار ہے
جو ذرہ ہے یہاں اُسے اک انتشار ہے
مرجع تمام خلق کا پروردگار ہے
ہر آن میں ہے شانِ خدائے قدیر کی
ہر سمت اک صدا ہے الیک المصیر کی

رباعیاتِ گرامی

ما نکہتِ دوست از چمن مے جوئیم
ما بوئے گل از دار و رسن مے جوئیم
صوفی خود را بجستجویش گم کرد
ما گم شدہ را بخویشتن مے جوئیم

از غصہ بخود مپیچ دوری اینست
حسرت مفروش ناصبوری اینست
باخود در بیخودی رسیدن سہل ست
بیخود در خود رسی حضوری اینست

ہر سوختۂ بسینہ دردے دارد
دست آویزے ز رنگ زردے دارد
گر عین نماندست اثر ہم ماند
دنبالۂ ہر قافلہ گردے دارد

پھول

"پھول" کے عنوان سے جو چند سطروں کا (بشیر احمد بیگم صاحبہ کا) مضمون ہے بڑے نازک اور دلآویز خیالات کا مرقع ہے میں نے اس نثر کے مضمون کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یعنی پہلے نادر خیالات کے یہ آبدار موتی بکھرے ہوئے تھے۔ اب سلکِ نظم میں پرو دئے گئے ہیں"۔

برقؔ دہلوی

پھول کیا ہیں؟ دل مایوس کی اُمیدیں ہیں
یہ وہ الفاظ ہیں بچے ہیں شناسا جن کے

سب سے پیاری ہے یہ مخلوق، مگر ربِّ قدیر
پھونکنی بھول گیا رُوح بدن میں اِن کے

ہم سے تو کرتے ہیں یہ پھول اشارے ہی فقط
آسماں اور خدا سے ہیں یہ محوِ تقریر

ہو کے آوارۂ دامانِ فضا نکہتِ گُل
اپنی شیرینی کی کرتی ہے دو بالا تاثیر

مست و بیتاب رہا کرتی ہے یوں موجِ شمیم
جس طرح ساز کے نغموں کی صدائے دلگیر

چرخ پر تاروں ہیں۔ بالائے زمیں پھولوں میں
نام لکھتا ہے قلمکارِ حقیقی اپنا

پھول ہیں مادرِ قدرت کی زبانیں گویا
جن سے کرتی ہے وہ اسرارِ محبت افشا

پھول کیا ہیں؟ یہ ہیں دامانِ زمیں کے تارے
کیسے دلکش ہیں سنہری ہیں یہ پیارے پیارے

اس لئے کھِلتے ہیں کچھ پھول کہ خنداں ہو کر
بوئے شیریں سے معطّر کریں بادِ صحرا

گُل وہ خوشیاں ہیں جہاں کی وہ گہرہائے امید
جو یہ کہتے ہیں "ہمیں بھول نہ جانا اصلا"

پھول دیتے ہیں ہمیں عیش و مسرّت کا پیام
جلوۂ حسن کا، موسیقی و نکہت کا پیام

(خیالات ماخوذ)
برقؔ دہلوی۔ بی۔ اے۔ منشی فاضل

برقؔ دہلوی

"حسنِ فردا"

اے جمالِ حسنِ فردا تو کہاں مستور ہے؟
تیرے جلووں میں پریشاں مایۂ صد طُور ہے

آشکارا تجھ سے شانِ جلوہ زارِ زندگی
تیرے دم سے رونقِ حسنِ بہارِ زندگی

ذرّہ ذرّہ بزمِ جہاں کا اضطراب آموز ہے
گرمئی ہنگامہ تیری کیا تپش اندوز ہے!

تیری آمد۔ آمدِ جوشِ بہارِ نازِ گل
تیری رنگینی پہ ہے قربان ہر اندازِ گل

شامِ غربت میں چراغِ جادۂ منزل ہے تو
آہ! کس لیلائے حسن افروز کا محمل ہے تو؟

ہر کلی تیری ہم آغوشِ سرودِ رازِ قُم
پتہ پتہ تیرے گلشن کا نوا اندازِ قُم

تو دلِ حسرت فشاں کا کعبۂ مقصود ہے
خواہشِ اقدام تجھ بن کاوشِ بے سود ہے

تیرے پہلو میں نہاں ہے حُسنِ پنہانِ ازل
آشکارا جلوہ پاشی سے تری شانِ ازل

تیری آمد۔ توسنِ امید کو مہمیز ہے
تیری صہبا سے ایاغِ زندگی لبریز ہے

بزمِ دل زیر و زبر کر دے وہ زیبائی تری
حُسن بھی جس کی بلائیں لے وہ رعنائی تری

جلوۂ خور۔ منبعِ تابندگی تجھ سے ہوا
یعنی عالم روشناسِ زندگی تجھ سے ہوا

خوگرِ بیداد۔ مسحورِ تمنا تجھ سے ہے
عشقِ حسن افروز مجبورِ تمنا تجھ سے ہے

چشمِ مشتاقِ امل کو کس قدر پیارا ہے تو!
شعبدہ ہے۔ یا طلسمِ دلنشیں ہے۔ کیا ہے تو؟

شوقِ دل۔ حُسنِ امل۔ جوشِ نمو۔ کچھ بھی نہ ہو
تو نہ ہو گر اے نگارِ آرزو! کچھ بھی نہ ہو۔

عہدِ طفلی ہو کہ ہنگامِ بہارِ زندگی
یا اُترنے کو ہو سب کیف خمارِ زندگی

دل گذرگاہِ سرورِ بادۂ امید ہو
یا سپردِ کاوشِ محرومیِ جاوید ہو

یا نصیبِ آرزو۔ عہدِ جوانی کے مزے
انبساط افروزِ عشرت کامرانی کے مزے

یا ہجومِ یاس سے دل میں شکیبائی نہ ہو
بازؤں میں ضعف سے کچھ بھی توانائی نہ ہو

کوئی منظر اپنی ہستی کا غرض ایسا نہیں
تیرے لطفِ بندہ پرور کا جہاں چرچا نہیں

اے نسیمِ گلستان اے مشک بیزِ آرزو
اے ضیائے آفتابِ جلوہ ریزِ آرزو

اے کہ تیری دید تسکینِ دلِ بیتاب ہے
اے کہ تیری شمع نورِ محفلِ مہتاب ہے

اے کہ می آری پیامِ انبساط اندوز را
در تو بینم دولتِ گم گشتۂ امروز را

خالد بی اے

جذباتِ عالیہ

حسرت موہانی

رنگ تیری شفق جمالی کا — اک نمونہ ہے بے مثالی کا

لاابالی مزاجِ یار کو غم — کیوں ہو میری شکستہ حالی کا

بزمِ ساقی میں دیدنی ہے سماں — خمِ لبریز و جامِ خالی کا

آئینہ ہے تبسمِ لبِ دوست — حسنِ خوباں کی بے ملالی کا

بگڑ دل میں بھی جو ہو لحاظ اُنہیں — کچھ بھی اس خطرۂ خیالی کا

اُس جفا کار تک کہاں پہنچا — ذکر میری خراب حالی کا

کچھ تو کر پاس اے وفا دشمن!
لبِ حسرت کی بے سوالی کا



ابر قدوائی

وفا پروردگانِ عشق میں ذوقِ فنا پایا — جسے پایا اُسے ہم نے پرستارِ قضا پایا

نہ بھولے سے غمِ جانکاہ کو لبِ آشنا پایا — دلِ غمدوست کو پابندِ آئینِ وفا پایا

نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے کہ دل آیا تو کیا پایا؟ — بُتِ ناآشنا پایا دلِ غم آشنا پایا

بڑھا دی اور رونق داستانِ غم کی اشکوں نے — کسی کو گر دلِ غمدوست کا درد آشنا پایا

خدا جانے تپِ غم سے دلِ بیکس پہ کیا گذری؟ — کہ جو اشک آنکھ سے ٹپکا اُسے حسرت نما پایا

دمِ آخر زباں تھی بند چشمِ منتظر وا تھی — وہ آئے دیکھنے کو تو درِ حسرت کھُلا پایا

دمِ عرضِ تمنا اُس کے اندازِ تبسم سے — کھلا اتنا کہ دل نے کچھ سراغِ مدعا پایا

ترے دم سے بتِ سفاک کو تو مل گئی فرصت — ارے او مرنے والے! جانِ دیگر تو نے کیا پایا؟

تماشا گاہِ حسن و عشق کی اللہ رے وسعت!! — ہر اک گوشہ کو دل کے عالمِ حیرت فزا پایا

نہ پوچھو واقعاتِ زندگی اُس مرنے والے کے
کہ جس بیکس نے خاکِ گور کو راحت فزا پایا
ازل ہی سے مری تقدیر میں یہ گریۂ غم ہے
محبت میں نہ میں نے آبرو کچھ اسکے سوا پایا

شرف

عشق کو رو رو کے پایاب تمنا کر لیا
درد کی موجوں نے ہر آنسو کو دریا کر لیا
تیغِ قاتل سے لپٹ کر کھنچ گئی جانِ حزیں
خون کی دھاریں ملا کر ایک نقشا کر لیا
جلوۂ جاناں بہت کھیلا ہے میرے دل کے ساتھ
روز پردہ توڑ ڈالا روز پردہ کر لیا
مژدہ اے بلبل کہ پھولوں کی ہنسی میں راز ہے
عشق کی نیرنگیوں نے رنگ پیدا کر لیا
صبح تک آنسو بہائے انتظارِ یار میں
رات بھر میں موتیوں کا ہار پورا کر لیا
بیخودی! میں اُس تغافل کیش کو کیا دوں جواب؟
پوچھ بیٹھا ہے کہ یہ کیا حال اپنا کر لیا؟
کہہ گئے پروانے جل کر۔ شمع تو ہنستی ہے کیا
تو رہی ناپاک ہم نے پاک قصہ کر لیا
اُن کے آگے اشک بھر بھر لائے آنکھوں میں شرف!
آپ چپ کے چپ رہے۔ شکوہ کا شکوہ کر لیا

یاس

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بند گانِ عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آئے تمکو جو ہر شمشیر دیکھنا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
پروانے کر چکے تھے سر انجامِ خودکشی
فانوس آڑے آگیا تقدیر دیکھنا
مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

چونکے تو چشم شوق میں عالم سیاہ تھا | خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور | بیربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے | حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا

بادِ مراد چل چکی لنگر اُٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا

ندرت

پی کر کسی کی بزم میں بیہوش ہو گئے | آنسو ہی ہمکو بادۂ سرجوش ہو گئے
کیا دل کی سرگذشت میں لذت نہ تھی کوئی؟ | افسانہ سُن کے آپ تو خاموش ہو گئے
آخر کو بات بڑھ گئی اے اضطرابِ دل | آمادۂ فغاں لبِ خاموش ہو گئے
پہلے تو میرا حال سُنا اہلِ حشر نے | پھر اُن کی شکل دیکھ کے خاموش ہو گئے
ہم نے جہاں میں آتے ہی پی لی شرابِ غم | گویا کہ آنکھ کھلتے ہی بیہوش ہو گئے
پہلے تو خوب کی دلِ گم گشتہ کی تلاش | پھر صبر آگیا ہمیں خاموش ہو گئے
اب جوشِ آرزو دلِ مایوس میں کہاں | وہ خواب وہ خیال فراموش ہو گئے
فریاد اپنی کوئی جہاں میں نہ سُن سکا | پچھتا کے اب ہم آپ ہی خاموش ہو گئے
پہلو ستم کے سوچتے رہتے ہیں رات دن | اللہ کس قدر وہ جفا کوش ہو گئے!!
ندرت بہار آتی ہے بے خوف پیجئے | رحمت کے بادل اب تو خطا پوش ہو گئے

غریب

موسم گُل ہے چمن سے آرہی ہے بوئے دوست | ہیں قفس میں بلبلیں بیتاب۔ بہر روئے دوست
کھینچتی ہے عندلیبوں کو گلستاں کی طرف | پتے پتے میں گلوں کے بس گئی ہے بوئے دوست
ذرہ ذرہ سے ہزاروں حشر ہوتے ہیں بپا | آسمانِ فتنہ ہے شاید زمینِ کوئے دوست
اے دلِ صد چاک تیری قدر اتنی بھی نہیں | دستِ شانہ کھولتا ہے عقدہ ہائے موئے دوست

عرشِ اعلیٰ سے بھی اونچے ہیں کہیں اُن کے دماغ　　خاک میں جو مل گئے افتادگانِ کوئے دوست

بند کر آنکھوں کو دیدِ غیر سے پہلے غریب!
جب نظر آئے گا تجھ کو چہرہ نکوئے دوست

تاجور

زبانِ حال سے کہتی ہے باغ میں شبنم　　مآلِ غنچۂ خنداں پہ اشکبار ہوں میں
مٹا نہ مجھکو۔ محبت کی خود فراموشی　　کہ اپنے بھولنے والے کی۔ یادگار ہوں میں!!
ہوں ننگِ زیست کہ جاں کر سکا نہ اُس پہ نثار　　کسی کے دردِ محبت سے شرمسار ہوں میں
ہے میری سادگیٔ عشق رحم کے قابل　　کہ بیوفا سے وفا کا امیدوار ہوں میں
ہوں مثلِ سبزۂ خوابیدہ وقفِ پامالی　　چمن میں رہ کے بھی بیگانہ بہار ہوں میں
فریبِ وعدۂ صبر آزما۔ خدا کی پناہ!!　　کہ ایک عمر سے پامالِ انتظار ہوں میں

معذرت

ہمایوں کے کسی گذشتہ نمبر میں ایک مضمون نگار کے قلم سے دو فقرے نادانستہ طور پر ایسے نکل گئے جنھیں مذہبی حملہ کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس مضمون پر صرف بحیثیتِ صحتِ زبان ہم نے نظر ڈالی تھی۔ رسالہ شائع ہونے کے بعد ہمیں اس کا احساس ہُوا کہ اس مضمون میں دو ناگفتنی فقرے بھی شائع ہو گئے۔ مذہبی چھیڑ چھاڑ کو ہم قطعی غیر مفید تصور کرتے ہیں۔ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ کسی قسم کے دل آزار مضامین ہرگز درج نہ ہونگے۔ ہم اپنے سب ہندوستانی بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے۔ گذشتہ فردگذاشت پر نادم ہیں اور طالبِ عفو۔

ہُمایوں کے مُتعلّق
مشاہیر اہلِ قلم کی رائیں

جناب مولانا گرامی شاعرِ خاص حضورِ نظام۔

خدمتِ عالی میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء تسلیم۔ یکتا ہُمایوں کا دوسرا نمبر مجھے مل گیا بُمکتب نمبرود نگر برندش" یعنی رجسٹری شدہ۔ کیا گرامی حضرتِ بشیر کے ارادۂ مستقیم اور طبعِ حلیم کی نسبت کچھ لکھے یا حضرتِ تاجور فاضل دیوبندی کی عقلِ سلیم سے زبانِ قلم کو گوہر ریز کرے ؎

بسانِ تاجور در نکتہ سنجاں ارجمند آمد
تعالی اللہ ہمایوں دیوگیرو دیوبند آمد

تہی مایگانِ باطل پرست کو ہمایوں نے سرنگوں کر دیا۔ ادبی اور اخلاقی رسالے میری نظر سے بہت گذرے بجائے خود بہت اچھے ہیں انصاف یہ ہے کہ اس مجلس میں ہمایوں کے سوا کوئی دوسرا میرِ مجلس ہو نہیں سکتا ؎

ہر یکے را در خورِ آں دادہ اند
بادہ رامستی و گردش جام را

والسلام گرامی

جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا ہوم سیکرٹری حضور نظام

مکرمی۔ ہمایوں کا کیا کہنا۔ آب و تاب میں مضامین کی بلندی اور پاکیزگی میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر رسالہ کا انتظام آپ ہی کے سپرد رہا اور اہلِ قلم معاونین اور مضامین کے انتخاب میں بہی احتیاط مدنظر رہی تو یہی ایک رسالہ ہو گا جو انگلستان کے مشہور رسالوں کا ہمسر ثابت ہو گا۔

خاکسار۔ ذوالقدر جنگ

شیخ فیروزالدین صاحب مراد ایم۔ ایس۔ سی۔ پروفیسر طبیعات علیگڈھ کالج۔

ہُمایوں پہنچا۔ خدا اُسے دیر تک زندہ رکھے اور کامیاب ہو۔ مجھے اُردو کے رسالوں پر کچھ اعتبار

نہیں رہا۔ وہ سپے معنے کاروباری معاملے ہوتے ہیں جن میں فقط تخیل کی زریاں کاریاں نظر آتی ہیں اکثر رسائل پر ان اعتراضات کا اطلاق ہوتا ہے لیکن ہر کلیہ مستثنیات رکھتا ہے۔ میں نے اب ہمایوں دیکھا ہے اور میں خوش ہوں کہ ہمایوں کے ایڈیٹر اُردو ایڈیٹروں کی اُس جماعت اکثرین میں سے نہیں ہیں جو کام کم کرتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں۔ توسیع اُردو اور ترویج سائنس یہ ہے میرا منتہائے کمال۔ اپنے مشاغل سے فارغ ہو کر ان کی توجہ مبذول کرنا میرے لئے باعث مسرت ہے۔ دو ماہ کے بعد میں انشاء اللہ ہر طرح ہمایوں کی قلمی کے لئے تیار ہوں گا۔

فیروزالدین

جناب مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز دہلوی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ بی

"ہمایوں" کا پہلا نمبر مجھے مل گیا۔ ماشاء اللہ بڑی آب و تاب سے نکلا ہے میں آپ کو اور لائق مدیر کو اس پرچہ کی خوبی ظاہر و باطن پر تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں میں بھی انشاءاللہ ہمایوں کی خدمت میں کوئی نظم یا نثر پیش کروں گا۔

خاکسار اعجاز حسین

جناب پنڈت میلا رام صاحب وفا پروفیسر پنجاب نیشنل کالج و سابق ایڈیٹر ہندے ماترم۔

عنایت فرمائے وفا جناب میاں صاحب تسلیم

رسالہ ہمایوں پہنچ رہا ہے اس عنایت کا تہ دل سے ممنون ہوں ارادہ ہوا تھا کہ پہلے نمبر پر اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں لیکن اس کے ظاہری و باطنی محاسن کو دیکھ کر جن کی نظیر سے پیشتر ازیں میری آنکھیں ناآشنا تھیں یہ خیال آیا ایسا نہ ہو رسالہ کے اگلے نمبر میری رائے کی تردید کر دیں۔ اب چونکہ دوسرا نمبر دیکھا ہے تو خود میرے اس خیال کی تردید ہو گئی ہے۔ دوسرا نمبر پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے ہیں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایسا رسالہ اردو زبان میں آج تک جاری نہیں ہوا آپ کو جو مضمون نگار ملے ہیں ان کی وجہ سے اگر تمام اردو رسائل ہمایوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھیں تو مقام تعجب نہیں اگر اُن اصحاب کے مضامین دلپذیر سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو خود ایڈیٹوریل حصہ بھی اس امر کی ناقابل تردید شہادت پیش کر رہا ہے کہ ہمایوں وفنی آپ جیسے سحر طراز ادیب اور بلیغ الملک علامہ تاجور جیسے فاضل جادو نگار کے زیر ادارت ہے۔ حضرت

بلیغ الملک نے اردو زبان کی جو خدمات خصوصاً پنجاب میں سرانجام دی ہیں وہ اہلِ مذاق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ رسالہ مخزن کو دوبارہ آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر کے زمانہ کی سطح پر لانا انہی کا کام تھا رسالہ ہمایوں میں علامہ کا شریکِ ادارت ہونا واقعی اس کی بلند اختری کی روشن دلیل ہے۔ کلام ہمایوں پر علامہ نے جو دادِ تنقید دی ہے وہ اس فن میں ایک بیش قیمت اور مستقل اضافہ ہے۔ بہرحال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دنیائے اردو کا ماضی وحال "ہمایوں" کی نظیر پیش کرنے یقیناً عاجز ہے۔ نیاز کیش میلارام وفا

جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔ اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی۔

ہمایوں مجھے اس قدر پسند آیا ہے کہ میں نے اس کا باقاعدہ فائل رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

خاکسار سجاد حیدر

جناب آنریبل ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی وزیرِ قانون حکومتِ ہند

ابھی مجھے ہمایوں کا دوسرا نمبر نہیں ملا پہلا نمبر میں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اور میں اس کے اجرا پر دوبارہ مبارکباد دیتا ہوں۔

آنریبل مسٹر لطیفی آئی۔ سی۔ ایس سکرٹری محکمہ تعلیم صوبہ پنجاب

ہمایوں کے مطالعہ سے میں نے بہت لطف اٹھایا اور میں آپ کو اس کی ظاہری وباطنی خوبیوں پر مبارکباد دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ لوگ اس کے مطالعہ سے بہت فائدہ حاصل کریں گے

ڈاکٹر ڈی۔ بی سپونر ایل ایل ڈی (محکمہ عمارات قدیم حکومت ہند) جنہوں نے بہت سی اردو نظموں کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا ہے اپنے خط میں فرماتے ہیں۔

ہمایوں پہنچا۔ مجھے بے انتہا پسند آیا۔ وہ ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے، اور مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آخر آپ نے میدانِ صحافت میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا ہے جہاں ایک نہایت مفید خدمت سرانجام ہو سکتی ہے، میں امید کرتا ہوں کہ ہمایوں کو وہ کامیابی نصیب ہو گی جس کا وہ مستحق ہے۔ جب ہمایوں پہنچا تو میں عربی لفظ "بشر" پڑھ رہا تھا اس نیک فال سے میرے دل کو یقین ہو گیا کہ ہمایوں ضرور کامیاب ہو گا۔

جناب لالہ کنور سین صاحب بیرسٹر ایٹ لا چیف جج جموں۔

میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے رسالہ ہمایوں کا پہلا نمبر مجھے بھیجا۔ میں نے رسالہ پڑھا اور اسے

فہرستِ مضامین بابتِ ماہِ اپریل ۱۹۲۲ء

جلد ۱ — نمبر ۴

حِصّۂ نثر

حِصّۂ نظم

جذباتِ عالیہ

ہمایوں کی جانب سے سو روپے

کا

انعامی مضمون

اُردو رسالوں میں غالباً "ہمایوں" سب سے پہلا رسالہ ہے جسے حالات کی مساعدت نے یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ اہلِ قلم کو بیگاری کے درجہ سے بالاتر سمجھے۔ اسی لئے اسکے پہلے نمبر میں یہ عام اعلان کر دیا گیا کہ جو پُر مغز و پُر معلومات اچھوتے مضامین محنت و کاوش سے لکھے جائینگے۔ صاحبِ مضمون کے ایماء پر اُنکا معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ اسی سلسلہ میں اب یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ذیل کے اہم عنوان پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں۔

اُردو ہندوستان کی مُلکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؟

(۱)۔ سب سے بہتر مضمون پر جو منصفوں کی رائے میں اولیّت کے معیار پر پورا اُترے ہمایوں کے سرمایہ سے ساٹھ روپے اور اسی حیثیت میں دوم نمبر کے مضمون پر چالیس روپے بطورِ انعام پیش کئے جائینگے۔

(۲)۔ اور اگر مضامین میں سے مقرر کردہ معیار پر کوئی بھی پورا نہ اُترے مگر ان میں بعض مضامین مفید اور جاذبِ توجہ ثابت ہوئے تو اول و دوم پر انعام کی مقدار منصفوں کی رائے پر مقرر کی جائے گی۔

(۳)۔ تمام مضامین ایک کمیٹی میں پیش ہونگے۔ جسکے ایک رُکن آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر بی-اے- بار ایٹ لاجج ہائیکورٹ پنجاب ہونگے باقی دو "ہمایوں" کے دونوں اڈیٹر۔

(۴)۔ مارچ کا ہمایوں چھپنے کے بعد سے تین ماہ تک مضامین کا انتظار کیا جائیگا۔ یہ سہ ماہی مدت اس لئے تجویز کی گئی ہے تاکہ زیادہ غور و مطالعہ کے بعد مضامین پُر مغز و پُر معلومات اور مدلّل پیرایہ میں لکھے جائیں؟

(۵)۔ مضامین فلسکیپ سائز کے زیادہ سے زیادہ تیس اور کم سے کم دس صفحات پر ہونے چاہئیں۔ (تاجور)

ضروری اطلاع:- جنوری کے پرچے کے لئے اتنی فرمائشیں آگئی ہیں کہ پرچہ عنقریب دوبارہ چھپوانا پڑیگا۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو جلد اطلاع دیں سالانہ خریداروں کے علاوہ دوسروں کے لئے اس پرچے کی قیمت ۱۴ر ہوگی۔ مینجر

ناظرین! سرورق کی متلوّن مزاجی ریلوے سٹرایک کی وجہ سے ہے! مینجر

بزمِ ہمایوں

بعض با مذاق حضرات لکھتے ہیں کہ ہمایوں میں لکھنے کو جی تو چاہتا ہے مگر مضمون کی تلاش میں دماغ پریشان ہے! عنوان نہیں سوجھتا + طبع زاد مضامین لکھنے والوں کے لئے تو اس "تلاش" کی جستجو میں آوارہ پھرنا بے معنی ہے۔ جس وقت طبیعت حاضر ہو اپنے دل کی حالت کو بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔ دُنیا کے کسی کام یا انسان کے کسی شغل کے متعلق بلاکم وکاست اپنے حقیقی خیالات کو سیدھی سادھی زبان میں بے تکلف طور پر ادا کر دینا معراجِ انشا ہے۔ البتہ یہ دولت کم لوگوں کو نصیب ہے؟

لیکن علم و تاریخ یا زبان و ادب کے متعلق اپنی یا دُوسری مایۂ دار زبانوں کے چمن سے گلچینی کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس میں عنوان نہ سوجھنے کی دشواری جاتی رہتی ہے +

اگر آپ علومِ جدیدہ کے مطالعہ سے حظ اُٹھاتے ہیں تو اُن علوم کے ایسے شعبوں کی طرف توجہ کیجئے جو زیادہ دلچسپ و سبق آموز ہوں، ہر ایسے موضوع پر جسے آپ انتخاب کریں اک چھوٹا مقدمہ لکھئے جو غیر ماہر لوگوں کو اُس علم کے بہت سے مبادیات سے آگاہ کر دے پھر اُنہیں زیادہ ادق مطالب کی طرف متوجہ کیجئے لیکن اس طرح کہ تحریر کی دلکشی دقتِ مضمون کو چھپائے رکھے اور پڑھنے والا اسی دھوکے میں رہے کہ یہ ادبی مضمون ہے! مستقل تصنیف کے لئے اتنی "ادبیت" کی ضرورت نہیں +

تاریخ کے ضمن میں بجائے اس کے کہ واقعات اور تاریخوں کا انبار جمع کر دیا جائے یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اُس خاص وقت کے ماحول میں لے جایا جائے اور وہ محسوس کرنے لگے کہ میں کسی دُور دراز ملک میں حقیقت کی نگاہوں سے سیر کر رہا ہوں + کسی ملک کی مختصر تاریخ بیان کیجئے تو اس طرح کہ سننے والا اپنے تئیں ایک ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا تصور کرے جہاں نگاہ جلد جلد ایک وسیع خطۂ زمین کو عبور کرتی چلی جاتی ہے + اُردو میں یہ کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ دُنیا کی مشہور تحریکات پر ایک نظرِ غائر ڈالی جائے اور تاریخِ انسانی پر اُس کے اہم نتائج کا اندازہ کیا جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھنے والا تاریخی مضمون کسی پُر عظمت شخص کی سیرت کا صحیح صحیح خاکہ کھینچتا ہے۔ اس فن سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں بلکہ اس کی سُودمندی کا احساس بھی شاذ و نادر پایا جاتا ہے +

(باقی) (ب ا)

جہاں نُما

چین کا مُستقبل چینی سفیر (لندن) چاؤ سن چوُ جنوری کے ایشیاٹک ریویو میں لکھتے ہیں "وہ شئے جسکی آج چین کو اشد ضرورت ہے انصاف ہے۔ انصاف ہی سے وہ تمام گورکھ دھندے دُور ہو سکتے ہیں۔ جنہیں "حقوقِ خاص" اور "حلقۂ اثر" کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ چین کے ساتھ انصاف برتنے سے نہ صرف مشرقِ اقصیٰ کا امن قائم رہیگا بلکہ ساری دُنیا چین سے زندگی بسر کریگی۔ مختصر یہ کہ چین میں امن ہونے اور چین کے ساتھ انصاف کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا بھر کو تجارت کا یکساں موقع ملے گا اور مشرقِ بعید میں دائمی سکون نظر آئیگا +

چین کے مالی حالات بحیثیتِ مجموعی درست اور تسلی بخش ہیں۔ چین کا اندرونی و بیرونی قرضہ ایک بلین ڈالر ہے۔ چالیس کروڑ نفوس پر پھیلانے سے اس کی اوسط ۲½ ڈالر (یا تقریباً ۲ روپے) فی کس بیٹھتی ہے۔ ٹیکس چین سے کم مشکل ہی کسی اَور ملک میں ہوگا یعنی فی کس ۱½ ڈالر۔ انگلستان میں ٹیکس کی اوسط تیس پونڈ فی کس ہے +

درآمد محصولات کے معاملے میں چین کو مطلق آزادی نہیں۔ اس کے ہاتھ اُن معاہدوں کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں جو دُولِ عظمیٰ نے اُس کے ساتھ کئے ہیں اور جن کی رُو سے یہ محصول غیر ممالک کے مال پر ۵ فیصدی سے زاید نہیں بڑھایا جاسکتا + اس سے بڑھ کر بے انصافی کیا ہوگی کہ چین کو اس معاملے میں آزادی نہ دی جائے اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کے بجٹ میں ہر سال اتنا گھاٹا نظر آتا ہے۔ چین حق بجانب ہے اگر اپنی مالی حالت کو بہتر کرنے کی غرض سے وہ دُولِ عظمیٰ سے اِن محصولات میں اضافہ کرنے کی اجازت چاہے۔ واشنگٹن کانفرنس میں چین کے نمائندوں نے کہا کہ چین کو کم ازکم ساڑھے بارہ فیصدی تک محصول لگانے کا حق عطا کیا جائے +"

مسٹر چوُ چین کی مالی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ چین کا شرح مبادلہ زمانۂ قبلِ جنگ سے بہتر ہے اور اُس کا شمار اُن چند در چند ممالک میں ہے جہاں کاروبار میں دھات کے سکّے چلتے ہیں اور کاغذ کے پُرزے مطلق نظر نہیں آتے" + (ب)

علمی شعاعیں

حبشی سیاہ کیوں ہیں؟ اس لئے کہ قدرت رنگ کے ذریعے سے جلد کی حفاظت کرتی ہے۔ روشنی کی شہ بنفشی کرنیں جو نظر نہیں آتیں سرسام گگروں اور امراضِ جلد کا باعث ہوتی ہیں۔ زرد یا سیاہ رنگ کا پردہ انہیں اپنا عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔ انسانی جسم میں جِلد کے نیچے ایک مادّہ ہوتا ہے جسے کرد موگن کہتے ہیں۔ جب شہ بنفشی کرنیں اس پر پڑتی ہیں تو وہ رنگ بن جاتا ہے۔ اس رنگ کے چار درجے ہیں۔ زرد (سفید قومیں) گہرا زرد (چینی اور جاپانی) سُرخ (امریکہ کے اصلی باشندے) اور بادامی (ہندوستانی اور حبشی)۔ ہمارا رنگ بھی اک معنی رکھتا ہے۔

بال اور سیرت۔ یہ بات طبعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ہر شخص کے بال اُس کی اصل و نسل اور اُس کی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جس صورت میں اُس کے بال اُگتے ہیں اور جس طرف کو بڑھتے ہیں اس سے اُس کے اعمال کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص آج کل کیا کر رہا ہے۔ اس کی عادات اور اکثر اس کے خیالات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غمگین طبع لوگوں کے بال عموماً سیدھے اور باریک ہوتے ہیں۔

ماہانہ مُدت۔ انگریزی مہینوں میں دنوں کی تعداد شروع میں اس قدر حافظے پر بار ڈالنے والی نہ تھی جیسی کہ اب ہے جولئس سیزر کے حکم سے جُفت مہینوں (جنوری۔ مارچ۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر اور نومبر) کے اکتیس ۳۱ دن قرار پائے اور باقیماندہ کے تیس سوائے فروری کے جس کے عام سالوں میں اُنتیس ۲۹ دن ہوتے تھے اور ہر چوتھے سال تیس ۳۰۔ جب آگسٹس سیزر روما کا شاہنشاہ ہُوا تو اُس کی خود پسندی سے یہ نہ دیکھا گیا کہ جولائی میں جو جولئس سیزر کے نام پر ہے اکتیس دن ہوں اور اگست جو شاہنشاہ کی یادگار ہے صرف تیس دن کا ہو۔ بیچاری فروری سے ایک اور دن چھین کر اگست کو دیا گیا اور ستمبر اور نومبر کی بجائے اکتوبر اور دسمبر کو اکتیس دن دیئے گئے تاکہ اکتیس ۳۱ دن کے تین مہینے یکجا نہ ہونے پائیں۔

امریکہ اور کولمبس۔ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا۔ پھر اُس کا نام بجائے امریکہ کے کولمبیا کیوں نہ رکھا گیا؟ میجر جو نقشہ کشی کا ایک ماہرِ فن ہے اس علمی ستم روائی کی کہانی یوں بیان کرتا ہے:۔ مئی ۱۵۰۷ء میں کولمبس کی وفات کے عین ایک سال بعد ایک ڈچ مارٹن والڈسی مُلر نامی نے ایک کتاب لکھی جس میں ضمیمہ کے طور پر امیریکس وسپوچی کے چار امریکی سفروں کا ذکر کیا گیا۔ اس کتاب میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ نئی دُنیا کا نام امریکہ رکھا جائے کیونکہ مصنّف کے نزدیک وسپوچی ہی نے پہلے پہل امریکہ دریافت کیا۔ ۱۵۰۹ء میں ایک گمنام تصنیف "کرۂ ارض" میں یہ نام اس طرح لکھا گیا گویا علمی حلقوں میں مشہور ہو چکا ہے۔ لینارد ود َونسی ایک اطالوی نقاش نے ۱۵۱۴ء میں جو نقشۂ دنیا شائع کیا اُس میں امریکہ کا نام شمالی وجنوبی براعظم دونوں پر لکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ڈچ مصنف اور ایک اطالوی نقاش کی خیالی قلم کاریوں نے کولمبس کو اپنی عملی کوششوں اور دقتوں کا ثمرہ نہ ملنے دیا۔

ستارے کیوں ٹمٹماتے ہیں؟ کسی رات کو جب مطلع صاف ہو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تارے چمکتے ہُوئے ٹمٹماتے ہیں لیکن بعض فقط چمکتے ہیں اور اُن کی روشنی ذرا جنبش نہیں کرتی۔ چمکنے والے تارے سیّارے ہیں جو ہماری زمین کی طرح گردش کرتے ہیں۔ اور ٹمٹمانے والے تارے اصلی تارے ہیں جو سورج کی طرح ساکن ہیں اور اُن میں بہت سے ہمارے نیّرِ اعظم سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ سیّارے صرف چمکتے ہیں لیکن ثوابت ٹمٹماتے بھی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا سبب ہماری فضا کی نمی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو سیّارے بھی کیوں ٹمٹماتے نظر نہ آئیں؟۔ ٹمٹماہٹ کے دو اسباب ہیں بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹمٹمانے والے تارے سیاروں کی نسبت بہت زیادہ بعید فاصلے پر واقع ہیں۔ فضا میں لاتعداد ایسے چھوٹے بڑے اجسام ہیں جو ادھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ اِن تاروں کی روشنی ان رکاوٹوں سے ہوکر گذرتی ہے تو زمین تک پہنچ کر ٹمٹماتی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیّارے صرف سُورج کی روشنی کا عکس ڈالتے ہیں لیکن ثوابت اپنی ہی روشنی کے ساتھ شعلہ ریز ہوتے ہیں جو کبھی زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کچھ کم۔

جیب کتروں کی روزی بند۔ ایک موجد نے جیب کتروں سے بچنے کے لئے ایک جیبی ایلارم

بنایا ہے۔ بجلی کی تار کپڑوں میں سی دئے جاتے ہیں۔ جونہی کوئی جیب کترا کچھ چرانے کے لئے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے چار ننھی شمعیں شعاع ریز ہوتی ہیں اور یہ روشن ہو جاتا ہے کہ جیب میں کوئی اجنبی ہاتھ اپنا کام کر رہا ہے +

نظری توانائی۔ کوئی شخص ٹکٹکی لگا کر ہماری طرف دیکھے تو ایک ناقابل برداشت احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے والوں میں ایک شخص جلد اپنی نگاہ ہٹا لیا کرتا ہے + ڈاکٹر چارلز روس ایک مشہور ماہر علم الجراثیم نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ میں ایک غیر مرئی توانائی ہے جس کی طاقت ساکن اشیاء میں حرکت پیدا کر سکتی ہے + اُس کا خیال ہے کہ غالباً روشنی میں کوئی ایسی شعاع ہے جس کا انعطاف یا اجتماع قوت پذیر ثابت ہوتا ہے +

وہ اور ہم۔ انگلستان کی (سنہ ۱۹۱۱ء کی) ۳½ کروڑ آبادی میں تعلیم پر ۶½ کروڑ پونڈ سے زاید خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ۵۶ لاکھ پونڈ (آٹھ کروڑ سے زاید روپیہ) دوسرے لفظوں میں یوں کہئے ہندوستان کی آبادی تقریباً انگلستان سے آٹھ گنا ہے لیکن انگلستان میں تعلیم کا خرچ ہندوستان سے بارہ گنا سے بھی زائد ہے +

شکسپئیر یا ہندوستان؟ لندن میں ایک شکسپئیر لیگ قائم ہوئی ہے جس کا مقصد شکسپئیر کی تصنیفات میں غلطیوں کی اصلاح کرنا اور اُس کے ڈراموں کے شاندار اڈیشن چھپوانا ہے۔ اس تحریک میں صرف علما ہی شامل نہیں بلکہ اکثر عام لوگوں کو بھی اس سے گہری دلچسپی ہے +

کارلائل کا تو یہاں تک خیال تھا کہ "اگر اہلِ انگلستان سے پُوچھا جائے کہ تم ہندوستان کا چھن جانا گوارا کرتے ہو یا شکسپئیر کا تو وہ بلا تامل جواب دینگے کہ ہندوستان کا اس کی وجہ یہ ہے کہ شکسپئیر قدرت کا عطیہ ہے انگلستان کو اور ہندوستان کا حصول فطرت کی کارگزاریوں کا نتیجہ ہے"

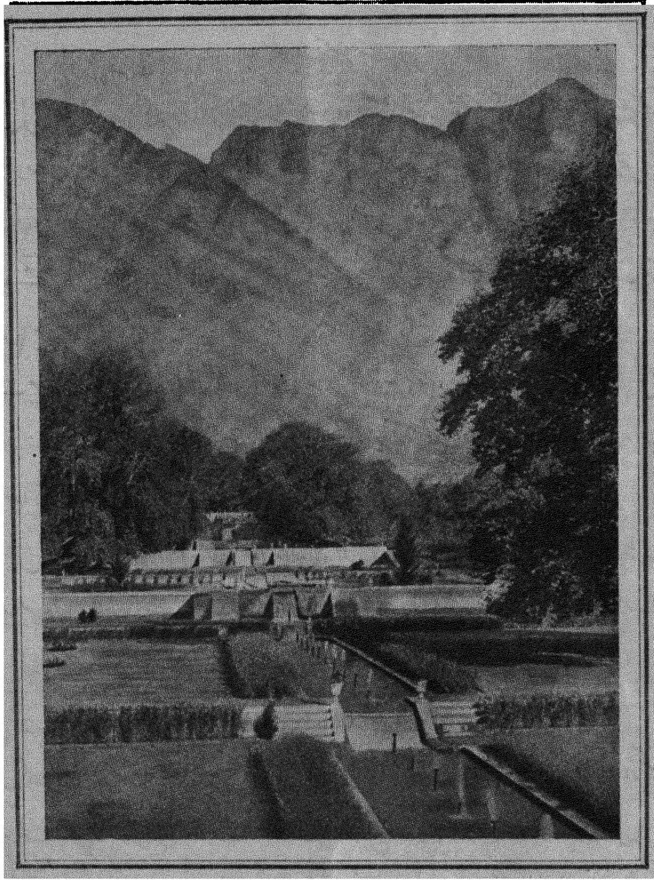
(ب ل)

نسوانی دُنیا

حکومتِ روس نے مردوں عورتوں کی برتری و کمتری کا سوال حل کر دیا ہے۔ "جیسا کام ویسے دام" کا اصول دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ حکومت کے تمام درجے عورتوں مردوں کے لئے یکساں طور پر کھول دئے گئے ہیں۔ عورتوں کو خانگی اُمور کے بارِ گراں سے رہائی دینے کے لئے حکومت نے "مادریت" کو ایک معاشرتی کام تسلیم کیا ہے اور حاملہ عورت کی نگہداشت کو اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ننھّے بچّے کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ بچّے کی پیدایش سے آٹھ ہفتے پہلے اور آٹھ ہفتے بعد میں عورت کے لئے کام کرنا ضروری نہیں اور اُسے سرکاری طور پر پوری تنخواہ اور ۲۵ فیصدی زائد رقم دی جاتی ہے۔ ایّامِ حمل میں عورت کو زیادہ مقررہ خوراک لینے کا حق ہے۔ اور زچگی کے سب اخراجات کی ذمہ دار بھی حکومت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی پرورش گاہیں ہیں جہاں ایک ماں بغیر فکر و تردد کے اپنا بچہ چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے جا سکتی ہے۔ عورتوں سے جنگی کام نہیں لیا جاتا۔

ناروے میں عورتوں کا ایک اخبار لوزر کو نڈر ہے جس کی مالکہ و مدیرہ ایک عورت ہے اور اُس کے اغراض و مقاصد نسوانی ترقی پر مشتمل ہیں۔ اُس کی اشاعت بارہ ہزار ہے اور وہ ہفتہ میں دو بار چھپتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ناروے کی آبادی صرف ۲۷ لاکھ ہے۔ ہندوستان میں پندرہ بیس کروڑ شخص اُردو بولتے یا سمجھتے ہیں۔ کیا سب نسوانی پرچوں کی اشاعت مل ملا کر اس سے نصف بھی ہوتی ہے؟ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اس مقابلے میں خاموش نظر آئیں گی۔

انگلستان میں قیدی عورتوں کی تعداد میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ چند سال ہوئے عورتوں کے لئے ایک سَو قید خانے تھے آج کل صرف پچیس ۲۵ ہیں۔ (د۔ل)



نشاط باغ (کشمیر)

نشاط باغ

(کشمیر)

مُغلوں کی عمارتیں اُن کے تمدّن کی متانت ہیں اور اُن کے باغ اُن کی شان وشوکت کا تبسّم!

وہ محبوب بادشاہت جس کی سطوت کا چاردانگ عالم میں ڈنکا بجتا تھا لیکن جس کی عظمت کا نشان اب خاک پر سرنگوں ہے کیا تھی؟ ہندوالوں کے دل میں اُس کی محبت کا سکہ کیونکر بیٹھا؟ اُس کی فلاح وثبات کے کیا اسباب تھے؟ اس کا اندازہ کسی ہندوستانی کے اُداس چہرے سے کیجئے جب وہ اک پُرانی مغلیہ عمارت یا باغ کی سیر کررہا ہو!

عمارت میں داخل ہوتا ہے تو مُلک وقوم کی مُردہ عظمت اُس کے دل پر اک کالی گھٹا کی طرح چھاجاتی ہے اور اُس کے مُنہ سے بے اختیار آہ نکلتی ہے کہ یہ ہیں اُن لوگوں کے کارنامے جو کبھی ہمارے درمیان خلوص و شفقت کے ساتھ حکومت کرتے تھے!

باغ میں جانکلتا ہے تو اُس شائیستگی کی یاد اک لہر بن کر جی میں اُٹھتی ہے جو فطرتِ انسانی کو قدرت کے حُسنِ معصوم کے ساتھ وابستہ دیکھنا چاہتی تھی اور جس کے عیش وعشرت کا کمال ہمیشہ مناظرِ کوہ و دشت کو اپنے شاملِ حال رکھتا تھا۔

کِس قدر بلند ہمت تھے وہ لوگ اور کتنی صاف وپاکیزہ تھیں اُن کی نیتّیں!

کہاں کہاں جائیے اور کس کس محل کو دیکھئے؟ کون کون سے باغ کی سیر کیجئے اور کس کس آبشار کے پاس بیٹھ کر رو دیجئے؟ اُن کی مسّرت کے سامان ہر طرح سے ہمارے لئے غم افزا ہیں!

البتہ مُغلیہ یادگاروں میں نشاط باغ ضرور اک ایسی یادگار ہے جو حقیقت میں نشاط انگیز ہے!

یہ باغ کشمیر کے دارالسلطنت سری نگر کے قریب مشہور ڈل جھیل کے مشرقی کنارے پر ساحلی پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ وہ سڑک جو جھیل اور باغ کے بیچ میں حائل ہے مغلوں کے وقت میں موجود نہ تھی اور باغ کا بابِ داخلہ ٹھیک جھیل کے کنارے پر تھا۔

زمین کے کاریگروں نے اِس رشکِ جنت گُلشن کو آسمان کے بارہ برُجوں کی رعایت سے بارہ تختوں میں تقسیم کیا ہے۔ جھیل میں اپنی کشتی کو کھیتے ہُوئے باغ کے قریب آئیے تو بارہ دری کے آگے ایک تختہ دُوسرے تختہ سے زیادہ بلند ہوتا ہُوا پہاڑ کی طرف چلا گیا ہے۔ باغ کا احاطہ ۵۹۵ گز لمبا اور ۳۶۰ گز چوڑا ہے اور اُسکے بارہ تختے ہیں۔ نیچے کے گیارہ تختے ایک دوسرے سے تھوڑی بلندی پر واقع ہیں لیکن بالائی تختہ جو صرف بیگمات کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ نیچے کے تختے سے اٹھارہ فٹ اونچا ہے۔

باغ کی سیرابی کے لئے پچھلے پہاڑوں سے ایک نہر آتی ہے جو بالاترین حِصّے میں داخل ہو کر ایک تختے سے دوسرے تختے میں دلکش آبشاروں کی صورت میں گرتی اور تالابوں کو لبریز کرتی ہُوئی باغ کے عین بیچوں بیچ بہتی ہے۔ مُغلوں نے جہاں کہیں اپنی عشرت گاہیں بنائیں قدرت کے حُسنِ زر ان کو ضرور شادابی و شادمانی کا سرمایہ دار بنا لیا۔ اُن کی منظر آرائی ہمیشہ پانی کی پیاسی رہتی تھی۔ سب سے اُوپر کے حِصّے سے ایک آبشار سانپ کی سی لہراتی لکیروں میں سے ہوتا ہُوا ہلکی آواز کے ساتھ نیچے کے تالاب میں جا گرتا ہے جس کے متموج کناروں پر بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کرنا حقیقت میں فردوسِ نگاہ ہے۔ ہر آبشار کے سر پر سنگِ سُرخ یا سنگِ مرمر کی ایک تخت نما نشست گاہ ہے جہاں دیکھنے والے کی نگاہیں گرتے ہُوئے پانی کی آواز میں غرقِ نظارہ ہو جاتی ہیں! پُرانے زمانے میں نہر کے دونوں طرف سرو کی قطاریں تھیں اور اُن کے عقب میں میوہ دار درخت۔ دیواروں پر گُلاب کی پیچ در پیچ بیلیں بوستانی زیب و زینت تھیں اور گلزاروں میں نرگس و یاسمن اور نسرین و نسترن کی بوقلمونیاں جلوہ آرا!

نشاط باغ شاہی باغ نہ تھا۔ اس کا مالک شاہجہان کا خُسر آصف خاں تھا جو بادشاہ کا وزیرِ اعظم بھی تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں جب شاہجہان کشمیر میں موسمِ گرما بسر کرنے کو آیا تو اُس نے اِس باغ کی سیر کی۔ اُس کے مرتفع تختے اور جھیل اور پہاڑوں کے نظارے اس قدر دلفریب تھے کہ شاہجہان نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ یہ باغ رعایا میں سے کسی ایک شخص کی ملکیت نہ رہنا چاہیئے۔ اُس نے آصف خاں کے سامنے تین مختلف موقعوں پر نشاط باغ کی تعریف کی یہ توقع کرتے ہُوئے کہ آصف خاں بلا تامل "باغ سبز است تحفۂ آصف" کہہ کر اپنا گلشن بادشاہ کی نذر کر دے گا۔ لیکن اگر بادشاہ کو جانفزا نظاروں کی حرص تھی تو وزیر بھی نشاط کو اپنی مسرت کی تنہا بساط سمجھے ہُوئے تھا۔ ہر دفعہ بادشاہ کی بات سُنتا لیکن مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہتا۔ اُس زمانے میں بھی شاہی باغِ شالامار اور نشاط باغ کی سیرابی کے لئے

ایک ہی مُشترک نہر تھی۔ بادشاہ نے حُکم دے دیا کہ نہر میں ایک بند لگا دیا جائے تا کہ نشاط باغ کی طرف پانی کی ایک بُوند نہ آنے پائے +

شاہجہان کے انتقام نے باغ کو ماتم کدۂ آرزو بنا دیا + نہر کے بند ہونے کے ساتھ تالاب سُوکھ گئے۔ آبشاروں کی آب و تاب نام کو بھی باقی نہ رہی۔ دو رویہ گلزاروں میں پھُول پژمُردہ ہو کر مٹی میں مِل گئے + نہر کے سنگیں کنارے بادشاہِ وقت کی سنگیں مزاجی کے شاکی تھے اور بے زبان فوارے زبانِ حال سے حکومت پر زبان بندی کا الزام دھرتے تھے + آصف خاں اپنے محل میں بیٹھا اپنے محبوب ترین باغ کو اُجڑتے ہُوئے نظرِ حسرت سے دیکھتا تھا لیکن زبان کو گفتگو کا یارا نہ تھا کہ لبِ شکایت وا کرتا۔ صرف دوست عزیز ہی دل کا حال جانتے تھے کہ اُس پر کیا گذر رہی ہے!

ایک دن اپنے خیالوں میں کھویا ہُوا وہ خشک نہر کے کنارے ایک سایہ دار درخت کے نیچے سو گیا + تھوڑی دیر کے بعد کچھ شور ہُوا اور وہ چونک پڑا۔ آنکھیں کھول کر کیا دیکھتا ہے کہ نہر پھر لبالب بھری ہُوئی ہے فوارے اُسی طرح جوش و خروش سے چل رہے ہیں اور آبشار اُسی بچپن کے انداز سے ایک تختے سے دُوسرے میں چھلانگیں مار رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھُول از سرِ نو شگفتہ ہو جائیں گے اور باغ پھر اُسی طرح سرسبز و شاداب! آصف خاں حیران تھا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اک وہم ہے یا خواب یا کیا؟

بات صرف یہ تھی کہ ایک باوفا خادم نے جو اپنے عزیز آقا کو مغموم دیکھ کر جی ہی جی میں بہت دنوں کڑھتا رہا اپنی جان پر کھیل کر بادشاہ کے حُکم سے سرتابی کی اور جا کر نہر کا بند توڑ دیا + آصف خاں نے اُسے بُلا کر سخت سُست کہا اور بند کو دوبارہ لگوا دیا + لیکن اتنے میں بادشاہ کو خبر ہو چکی تھی۔ حُکم دیا کہ گستاخ نوکر کو فوراً حاضر کیا جائے۔ نوکر کانپتا ہُوا آیا اور آداب بجا لا کر فرمانِ موت کا انتظار کرنے لگا + خوانین و اُمرا اور باقی اہلِ دربار حیران رہ گئے جب بادشاہ نے بجائے سزائے موت کے اُسے خلعتِ فاخرہ عطا کرنے کا حُکم دیا اور اُس کے ایثار و خدمت کی داد دیتے ہُوئے اُس کے آقا کو ایک سند بخشی جس کی رُو سے اُسے ہمیشہ کے لئے شالا مار کی نہر سے نشاط باغ کو سیراب کرنے کا حق حاصل ہو گیا +

بشیر احمد

سائنس اور جنگ

ایک زمانہ تھا جبکہ نقطۂ شجاعت، مردانگی اور قوتِ بازو پر جنگ کا انحصار تھا۔ یہی صفات حریف سپاہیوں اور محارب قوموں کی جنگی قابلیتوں کا معیار سمجھے جاتے تھے۔ اِس وقت اِنسان کی جنگ ایسی ہی سیدھی سادھی تھی جیسا کہ اُس کا تمدن۔ لیکن جوں جوں رفتارِ زمانہ کے ساتھ اِنسانی دماغ ارتقاء کے زینے طے کرتا گیا اور وسعت معلومات کی وجہ سے مادّی دنیا کی مخفی طاقتوں پر اس کا تصرّف و اقتدار بڑھتا گیا۔ زمانۂ امن کی ضروریات اور میدانِ جنگ کے لوازمات دونوں پہلو بہ پہلو ترقی کرتے گئے۔ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے علومِ مادیہ کی حیرت انگیز رفتارِ ترقی نے بنی نوعِ انسان کی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ایک عجیب انقلاب کی سی صورت پیدا کر دی ہے۔ اِنسانی دماغ نے مادیات کے میدان میں جو عظیم الشان فتوحات حاصل کی ہیں ان کے ذریعہ سے انسان نے ایک مزید طاقت حاصل کی ہے۔ جس کے مقابلہ میں اُس کی ذاتی اور جسمانی طاقت کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ سائنس کا ہر نیا ایجاد و اختراع اُس کی قوت میں ایک نئے اضافہ کا حکم رکھتا ہے۔ ان اکتسابی طاقتوں کے استعمال پر اب اُس کے امن اور جنگ دونوں کا دارو مدار ہے۔

تمدنِ دماغی ترقی کے قدم بہ قدم ترقی کرتا چلا آیا ہے۔ جنگ چونکہ تمدن کی تصویر کا ایک رُخ ہے اِس لئے اس کی حالت اور رفتار بھی دماغی ترقی اور بالخصوص علومِ مادیہ کی توسیع کے زیرِ اثر ہے اس کے ارتقاء کے قوانین بھی وہی ہیں جو تمدن کی تصویر کے دوسرے رُخ یعنی "امن" کے ہیں۔ انسان کا دماغ مادہ کے خلاف مصروفِ پیکار رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا راز تلاش و جستجو میں مضمر ہے۔ یہی جستجو کی آرزو اس کے تمام افعال و حرکات کی مُحرک ہوتی ہے۔ بنابریں وہ مادہ کی اُلجھنوں میں پڑ کر قدرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے اور بتدریج اپنے تصرّف کا احاطہ وسیع کرتا رہتا ہے۔ یہ انسانی دماغ کی اصلی جنگ گاہ ہے جہاں علوم نشو و نما پاتے ہیں۔ پھر ان علوم سے انسان اپنی زندگی کی حفاظت و استحکام کے سامان مہیا کرتا ہے۔ کبھی امن کی چار دیواری میں آرام و آسائش سے بسر کرتا ہے اور کبھی میدانِ جنگ میں اپنی قوت کے جوہر دکھاتا ہے۔

کبھی تعمیر میں دل لگاتا ہے۔ اور کبھی تخریب سے جی بہلاتا ہے۔ جس قصرِ امن کو برسوں کی محنت و جانکاہی کے بعد تعمیر کرتا ہے اُسی کو منہدم کرنے کے لئے سر توڑ کوششیں بھی کرتا ہے۔ اس کی تعمیر میں تخریب پنہاں ہے اور تخریب میں تعمیر کا راز مضمر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جن سامانوں سے تعمیر میں مدد لی جاتی ہے وہی سامان تخریب کے بھی کام آتے ہیں۔ اس معمۂ حیاتِ انسانی پر غالب مرحوم کا یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہ "اجتماعِ ضدین" "فلسفہ حیات" کا ایک نہایت ہی باریک مسئلہ ہے جس پر مزید بحث کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں۔ گو اس کے کڑوے پن کو ہر ایک متنفس محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس سے گریز بھی نہیں ؎

گر شربت و گر زہر، بلب چوں رسد ایں جام
باید ہمہ نوشند چشیدن نگذارند

ہاں۔ اگر انسان کی روحانی و اخلاقی قوت بالکل مُردہ نہ ہو گئی ہو۔ تو وہ ہمیشہ "تعمیر" کو "تخریب" پر ترجیح دیگا اور امور "تخریب" کو "ایک اخلاقی جرم" تصوّر کرتے ہوئے حتی المقدور اُس کے حلقۂ اثر کو کم کرنے کی سعی کریگا۔ سائنس کی وسعت سے جو طاقت انسان کو نصیب ہوتی ہے وہ تو بدستور روزافزوں ہوتی چلی جائیگی۔ لیکن اس طاقت کے استعمال کی نوعیت کیا ہو گی؟ یہ "صاحبِ طاقت" کی "اخلاقی سطح" پر منحصر ہے۔ بعض لوگ سائنس اور سائنس دانوں کو یہ الزام دیتے ہیں کہ انہیں کی ایجادات کے طفیل تباہی و بربادی کے سامان بیش از بیش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ درست ہے اور تجربہ و مشاہدہ اس امر کے شاہد ہیں کہ سائنس کی ترقیات تباہی و بربادی کے سامانوں کو بڑھا رہی ہیں۔ مگر سائنس کا جواب بھی معقولیت سے خالی نہیں۔ بیشتر اس الزام کے مستحق وہ لوگ ہیں جو سائنس کی بخشی ہوئی طاقتوں کے استعمال پر قادر ہیں یعنی کارپردازانِ سلطنت نہ کہ بیچارے سائنس دان جو فقط وسعتِ علوم کی خاطر اپنی تجربہ گاہوں میں شب و روز مشغول رہتے ہیں۔ اور جنہیں اس کے عوض میں پیٹ بھر کر روٹی بھی میسّر نہیں آتی۔ سائنس کے اکثر اکتشافات و ایجادات محض

توسیع علم یا بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص ایک ایسا انجن ایجاد کرتا ہے جس میں پانی بھر کر نہایت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہوئی آگ پر پھینکا جا سکے۔ ایسی ایجاد کا نوع انسان کے لئے غائیت درجہ مفید ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ اور ہم ہر روز اپنی بستیوں میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جہاں ذراسی آگ نمودار ہوئی جھٹ آگ بجھانے کا انجن آ پہنچا۔ اور چند ساعتوں میں وہ آگ جس کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے دفعتہً غائب ہو گئی۔ اب اگر کوئی چاہے تو اسی مفید ایجاد سے "تخریب" کا کام بھی لے سکتا ہے۔ اس طرح کہ بجائے پانی کے پٹرول سے کام لے نتیجہ یہ ہوگا کہ آگ بجھنی تو درکنار اور مشتعل ہوگی۔ مگر ظاہر ہے کہ انجن کے اس "ناجائز" مصرف سے اصلی موجد اور سائنسدان پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ایجاد کرتے وقت اس کو یہ گمان تک بھی نہ ہوگا کہ اسکے ایجاد کردہ انجن کو اس مصرف کے لئے بھی استعمال کیا جائیگا۔ اس مصرف کے تلاش کرنے میں سائنسدانی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ تھوڑی سی "عقل چارہ کار" اور تھوڑی سی "شیطنت" درکار ہے اور بدقسمتی سے دنیا میں ایسے "صاحب قدرت اہل دول" کی کمی نہیں جو سائنس کے مفید ترین ایجاد سے بھی ہر جائز و ناجائز فائدہ حاصل کرنے کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ جراثیم کی تحقیقات نے علوم طبیہ کو بہت ترقی دی ہے اور اس کا بنی نوع انسان کے لئے مفید ہونا اظہر من الشمس ہے مختلف بیماریوں کے جراثیم تباہ و برباد کر دئے جاتے ہیں اور اس سے بیماری رک جاتی ہے۔ لیکن جو سائنس جراثیم کو فنا کر دینے کے طریق سکھلاتی ہے وہی سائنس ان جراثیم کو پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ عام طور پر تو سائنس سے پہلا کام ہی لیا جاتا ہے لیکن دنیا کی اخلاقی حالت ایسی نہیں۔ کہ دوسرے مصرف کا خطرہ مفقود سمجھا جائے۔

اگرچہ اس سے پیشتر بھی دوربین نگاہوں سے کچھ مخفی نہ تھا کہ تمدن حاضرہ کی موجودہ روش اور سائنس کی ترقیات میں ایک سخت خطرناک پہلو موجود ہے، لیکن گذشتہ جنگ نے اس امر کو اس خوبی سے ہر شخص پر واضح کر دیا ہے کہ مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ سائنس کی معلومات ایسی نہ تھیں جو دشمن کی جان لینے یا اپنی جان بچانے کے کام آسکتی ہوں اور اس سے اس جنگ میں کام نہ لیا گیا ہو۔ مزید براں تجربہ کار و کہنہ مشق سائنس دانوں بالخصوص ماہرین کیمیا اور انجینیروں کو اس مطلب کی تنخواہیں دی جاتی تھیں کہ وہ ایسی ایجادیں کریں جن سے میدان جنگ میں کام

لیا جاسکے اور تھوڑے وقت میں زیادہ آدمی موت کے گھاٹ اُتارے جاسکیں۔ دورانِ جنگ ہی میں جرمنوں نے پچھتر میل والی توپ ایجاد کی اور اب سنا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی انجینیر نے ۱۱۰ میل والی توپ تیار کی ہے جو غالباً آئندہ جنگ میں استعمال کی جائیگی۔ اگر ان تمام ایجادات اختراعات و انکشافات کو جو جنگ کے دوران میں جنگ کی وجہ سے معرضِ ظہور میں آئے ہیں اکٹھا کیا جائے تو ایک نہایت طول طویل فہرست ہوگی۔ میں اس جگہ فقط ایک ایسے "ایجاد" کا ذکر کرونگا جو خاص اسی جنگ کی پیداوار ہے۔ اور جس کی وجہ سے فنونِ حربیہ میں ایک مستقل اضافہ واقع ہوا ہے۔

جب جنگ اپنے پورے زور پر تھی اور ہر ایک فریق محارب اپنے تمام مادی۔ دماغی اور اخلاقی ذرائع کو حدِ امکان تک استعمال کرنے میں کوشاں تھا تاکہ اس کشمکشِ حیات کے خوفناک تلاطم سے زندہ اور کامراں نکل آئے۔ اس وقت جرمن کیمیا دانوں نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا کہ فولاد اور گولہ بارود کے علاوہ بھی کوئی ایسی چیز ہوسکتی ہے جسے میدانِ جنگ میں ذریعۂ ہلاکت انسانی بنایا جائے۔ غالباً مسئلہ حل طلب کی صورت یہ ہوگی۔ جنگ کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ کم سے کم عرصہ میں حتی الوسع دشمن کی زیادہ سے زیادہ فوج یا تو ہلاک کردی جائے یا جنگی کام کے لئے ناقابل کردی جائے۔ اس مقصد کے لئے انسان نے وقتاً فوقتاً آلاتِ حربیہ ایجاد و اختراع کئے ہیں۔ قریب سے فولاد اور بمب استعمال میں آتے۔ دُور سے گولہ بارُود کام دیتے ہیں۔ لیکن کیا ان کے علاوہ اُسی مقصد کے حصول کے لئے کوئی اور طریق ممکن نہیں؟ کیا سائنس با ایں ہمہ ترقی کسی ایسے وسیلہ کے مُہیّا کرنے سے قاصر ہے؟ علمِ کیمیا کی تاریخ شاہد ہے کہ سینکڑوں کیمیا دان اپنی تجربہ گاہوں میں ایسے تجربات کرتے کرتے راہیِ مُلکِ عدم ہو گئے جن میں ایسی گیسوں سے واسطہ پڑتا تھا جو انسانی قوائے حیات پر نہایت زہریلا اثر رکھتی تھیں۔ کیا ان شہیدانِ علم کی اس سے بہترین یادگار" ہو سکتی ہے کہ جن گیسوں کی خصوصیات معلوم کرنے میں انھوں نے اپنی قیمتی جان دے ڈالی۔ اُنہیں گیسوں کی زہریلی خاصیتوں سے دشمن کی فوج کو ہلاک کرنے اور جنگ کو کامیابی کے نقطہ تک پہنچانے میں فائدہ اُٹھایا جائے؟ باقی رہا ایسی گیسوں کا بڑے پیمانے پر بنانا اور خندقوں تک پہنچانا تو یہ جرمن کیمیا دانوں کے لئے کوئی دقت طلب بات نہ تھی۔ انھوں نے ایسی گیسوں سے ابتدا کی جو نہایت آسانی سے مُہیّا ہو سکتی تھیں۔ سب سے اوّل جو گیس میدانِ جنگ

میں استعمال کی گئی وہ کلورین (chlorine) گیس تھی یہ وہی گیس ہے جو سوڈیم دھات سے مل کر نمک پیدا کرتی ہے۔ اِس گیس کو مائع کی حالت میں تبدیل کر کے آدم قد لوہے کے پیپوں میں بند کر کے خندقوں میں مختلف مقامات پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

اپریل سنہ ۱۹۱۵ء میں محاذِ فرانس پر اس گیس کا اولیں حملہ کیا گیا۔ ایک دن ہوا کا رُخ حسبِ منشا پاکر جرمنوں نے اپنے گیس کے ذخیروں کے مُنہ اتحادی خندقوں کی طرف کھول دیئے۔ اتحادیوں کے لئے یہ آفتِ ناگہانی تھی جس نے آناً فاناً میں ہزاروں سپاہیوں کو ہلاک کر دیا اور باقیماندہ کو ایسے سخت عذاب میں مبتلا کر دیا جو حالاتِ نزع کے مساوی تھا۔ اتحادیوں کو یہ وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ جرمن علمِ کیمیا کا یہ پہلو بھی جنگی مصرف میں لا سکتے ہیں۔ اُن کے غصّہ و رنج کی انتہا نہ رہی۔ فرانس و انگلینڈ کے اخبارات نے بہت شور و غل کیا۔ گالیوں کے کارتوس چلائے گئے۔ بتایا گیا کہ یہ معاہدہ ہیگ کی رُو سے سراسر ناجائز حرکت ہے۔ لیکن اس طرف سے ایک ہی جواب تھا۔ یعنی یہ کہ عشق و جنگ میں ہر حرکت جائز حرکت کا حکم رکھتی ہے۔" بالاخر اتحادیوں نے اس حملہ کے خلاف دماغی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ دماغ کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ اپنے سپاہیوں کی گیس سے حفاظت کی جائے۔ اس مطلب کے لئے "گیس ماسک" Gas mask یعنی گیس سے بچانے والا نقاب یا ٹوپی اختراع کی گئی۔ ہر ایک سپاہی اپنے منہ پر ایک ٹوپی اوڑھے رکھتا تھا۔ ٹوپی یا نقاب کا کپڑا جو فلالین کا تھا ایسی ادویات کے سالیوشن میں بھگو لیا جاتا تھا جو زہریلی گیس کو جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مثلاً کلورین گیس کو جذب کرنے کے لئے "ہائپو" Hypo استعمال کیا جاتا تھا۔ (یہ وہی "ہائپو" ہے جو فوٹوگرافی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے)۔ مُدعا یہ تھا کہ اگر ہوا میں کوئی زہریلی گیس ہو تو وہ مُنہ یا ناک تک پہنچنے سے پہلے نقاب کے کیمیائی مواد کے اندر ہی جذب ہو جائے۔

دماغ کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ گیس کا جواب گیس میں دیا جائے۔ چنانچہ اتحادیوں نے بہت جلد اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اور ایک بڑے پیمانے پر تیاری کے بعد ستمبر ۱۹۱۵ء میں انہوں نے بھی گیس کا استعمال شروع کیا۔ اتحادی کیمیادان بھی میدانِ جنگ میں پہنچے۔ جس طرح توپ چلانے کے لئے توپچی درکار ہوتے ہیں اسی طرح فوج میں گیس چلانے کے لئے کیمیادان بھرتی کئے گئے۔ ان کے علاوہ محاذ کے عقب میں سینکڑوں کیمیادان نئی زہریلی گیسوں کی دریافت اور اُن کے

استعمال کے طریق اختراع کرنے میں مصروف تھے۔ جرمن فرانس اور انگلستان کی تجربہ گاہیں اس کام کے لئے وقف تھیں۔ اب محارب قوموں کے زورِ بازو کا مقابلہ نہ تھا بلکہ اُنکی کیمیا دانی کا مقابلہ تھا۔ فریقین کی یہی کوشش تھی کہ ہر موقعہ پر نئی سے نئی گیس استعمال کی جائے تاکہ دشمن بے خبری کی وجہ سے اچھی طرح دماغی تدابیر عمل میں نہ لاسکے۔ اس سعی میں بہت سی گیسیں استعمال کی گئیں اور بہت سی نئی اور پیچیدہ ترکیب والی گیسیں معلوم کی گئیں۔

کلورین کے علاوہ ایک اور گیس استعمال کی گئی جسے انگریزی میں فاسجین phosgene کہتے ہیں۔ اسے کلورین پر اس لئے ترجیح تھی کہ بے رنگ ہونے کی وجہ سے اسے محسوس کرلینا آسان نہ تھا۔ اس گیس کا اثر فوراً ظاہر نہ ہوتا تھا بلکہ کچھ وقت گذرنے پر اور اس وقت یہ بلائے بے درماں ثابت ہوتی۔ غالباً جو گیس جنگی نقطۂ خیال سے بہت "کارآمد" ثابت ہوئی وہ مسٹرڈ گیس Mustard gas تھی۔ پھیپھڑوں پر مہلک اثرات کے علاوہ اس کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ تھوڑی مقدار میں بھی جسم کے کسی حصہ کو چھو گئی تو اُسے جلا ڈالا اور زخم پیدا کر دیا۔ بالخصوص آنکھوں پر اُس کا اثر بہت نمایاں تھا۔ اکثر حالتوں میں عارضی طور پر اندھا کر دیتی اور بعض حالتوں میں تو مستقل طور پر بینائی کو تباہ کر دیتی۔ بعض ایسی گیسیں بھی استعمال کی گئیں جو آنکھوں میں آنسو لے آتی تھیں۔ اگرچہ اُن کا اثر مہلک نہ ہوتا لیکن سپاہیوں کو فرائض کی انجام دہی سے عارضی طور پر روک دیتیں۔ منجملہ اُن کے ایک گیس کلوروپکرن Clloro picrin تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ مہلک اور زود اثر گیسیں پیدا کی جاچکی تھیں یا پیدا کی جارہی تھیں لیکن التوائے جنگ نے اِن کو میدانِ جنگ کی تجربہ گاہ سے محروم کر دیا۔ اور اِس طرح بہت سے کیمیا دانوں کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ لیکن خیر سے یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی باوجود گذشتہ جنگ کے تلخ تجربہ کے متمدن اقوام کا رویہ بدستور یہ ظاہر کرتا چلا رہا ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ ہولناک جنگ کا خطرہ ابھی دُور نہیں ہُوا۔ غیر مسلح کرنے کی کانفرنسیں اس انسانی تصادم کو روک نہیں سکتیں۔ اور انجمن اقوام کے تنخواہ یافتہ ناصحین کی تقاریر اور مضمون نگاروں کے قلم اقوام متمدنہ کی آتشِ حرص و آز کو جسے سائنس کے ایندھن سے ہر روز نئی مدد اور قوت نصیب ہو رہی ہے۔ فرو نہیں کر سکتیں یہ خطرہ اُس وقت تک کم نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل ہے

کہ جنگ مٹ بھی سکتی ہے) جب تک تمدن کے بنیادی اصولوں اور ملک داری کے موجودہ سیاسی و اقتصادی نقطۂ خیال میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو جائے اور دنیا کی کھوئی ہوئی اخلاقی و روحانی قوت پھر عود نہ کر آئے۔ ورنہ جہاں تک خود ساختہ ناصح کی نصیحت کا تعلق ہے عشق اور جنگ دونوں کا ایک ہی جواب ہے۔ بقولِ حضرت غالب ؎

گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا؟

کیا ہُوا جو جنگ فتح ہو گئی اور "نئی دنیا" کے کیمیا دانوں کو میدانِ فرانس کو اپنی کیمیائی علوم کی تجربہ گاہ بنانے کا "فخر" نصیب نہ ہُوا۔ آخر انہوں نے گھر جا کر اپنی حسرت نکال ہی لی۔ ابھی کچھ دن نہیں گذرے کہ ہمارا خبر رساں رائیٹر نئی دنیا سے پرانی دنیا کو بزبانِ برق یہ "مژدۂ جانفزا" سناتا ہے کہ امریکہ کے کیمیا دانوں نے ایک ایسی خوفناک زہریلی گیس دریافت کی ہے جو ہر قسم کی رکاوٹ سے گذر کر چمڑے تک فوراً اثر کر جاتی ہے۔ یہ گیس خاص طور پر ہوائی جہازوں سے انسانی بستیوں پر چھوڑنے کے لئے موزوں ہے۔ یہ گیس دنیا کے سب سے بڑے زہریلی گیسوں کے بنانے والے کارخانہ میں بنائی گئی ہے جو بالٹی مور کے قریب واقع ہے۔ یہ وہی کارخانہ ہے جو التوائے جنگ کے وقت روزانہ ۲۰۰ ٹن کے قریب زہریلی گیس پیدا کرتا تھا اور جس کا عملہ جارحانہ و مدافعانہ دونوں قسم کی ایجادات و اختراعات میں مصروف رہتا ہے۔ ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ جنگ جس میں مذکورہ بالا گیس اور اسی قبیل کی اور گیسیں استعمال کی جائیں گی۔ کیسی جنگ ہو گی۔ ایک ہوائی جہاز۔ ایک ٹن گیس اور ایک "قابل" اور "باہمت" جہاز ران۔ بس یہ سامان ہیں جو ایک لاکھ نفوس کی بستی کو پانچ منٹ کے اندر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دینے کے لئے درکار ہوں گے۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

منظفر الدین منظر

تحقیق الالسنہ

گذشتہ سے پیوستہ

وہ لوگ جو آج کل غیر زبانوں کی علمی کتب کا ترجمہ کرتے ہیں اُردو میں مناسب اصطلاحات کی غیر موجودگی سے بہت تکلیف اُٹھاتے ہیں اگر وہ مندرجہ بالا اصول کے موافق انہیں غیر زبان اصطلاحات کو عربی صورت پر واپس لے آئیں تو وہی اصطلاحات ایک طرف تو اردو فارسی عربی جاننے والوں کے لئے قرینِ فہم ہونگی دوسری طرف محض غیر زبان جاننے والوں کی رسائی ذہن کے لائق ہونگی جیسا کہ ستاروں اور برجوں کے ناموں کی مطابقت سے ظاہر ہے۔

اب ہم اہل تطبیق کے مزید اطمینان کے لئے سنسکرت اسمائے علوم کو عربی صورت میں پیش کرتے ہیں +

اسماء علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
کاویہ	نظم	قافیہ	از قفو نظم مقفّی و قصیدہ مدح و ذم گفتن ۔
ناٹک	ڈراما	ناطق	بوزن خاتم سرائیدن و مکالمہ فَ وَ تبادل اہل سنسکرت نٹ بمعنی ناچنا سے ماخوذ بتلاتے ہیں۔ عربی میں نطّ بمعنی بیہودہ گوئی نَطّح بمعنی سرائیدن ہے مگر ڈراما میں سب سے زیادہ نمایاں چیز ایکٹروں کا مکالمہ ہے ناچنا ضروری نہیں ہے +
تتّوُ وِچار	فلسفہ	تَا تُوء بصار	تَا تُو۔ اسم فاعل اَتو مثل تخضور از خضر بمعنی اصل و تخم و نشو و نمائے تخم۔ بصار بمعنی غور و فکر و علم ۔
وِیدانْت	توحید	وحدہ اَنتیٰ وحدانیت	سنسکرت میں ویدانتا بمعنی وید کی انتہا بتلایا گیا ہے۔ مگر عربی میں اَنتیٰ بمعنی حاصل و ثمرہ وید کا۔ جو زیادہ مناسب ہے کیونکہ تمام علوم کو وید سے ماخوذ سمجھا گیا ہے۔ پھر وید عربی

اسماء علوم	معنی	عربی صورت	شرح معانی عربی
			میں بمعنی علم توحید الہٰی ہے کیونکہ وہ مبدل وحد کا ہے۔ انت بمعنی انتہا عربی میں عنت ہے اور انتا مشابہ انتہاء۔
تیاے	منطق	نہاء	از نہی۔ علم درستی کلام و از خطا باز دارندہ۔ وبصواب برندہ
جوتش	ہیئت	جَوّۃ اِسّ	جَوّہ فضائے آسمان و زمین۔ اِسّ نشان دہندہ یا ضُوءَۃ بمعنی ستارہ۔
ریکھا گُنَت	ہندسہ	رَیقَعْ قَنتّ	ریقع از رقع۔ اندازہ نمائے فاصلہ بخطوط بنشتہ۔ قَنّت قانون وضابطہ۔ صرف رَیقع کافی تھا۔
بیج گَنَت	جبر ومقابلہ	بُیَجْ قَنَتّ	بُیَج۔ مساوات بذریعہ آوازہا یعنی حروف۔ جبر ومقابلہ کے تمام قواعد مساوات کے محتاج ہیں۔
ویدک	طِبّ	دَیَدق	از دَدق۔ آرام دہندۂ امراض جسم۔ دیَد کہتے ہیں کہ یہ وید سے ماخوذ ہے اس لئے ویدک نام ہُوا مگر طب کا مفہوم اس سے ظاہر نہیں ہوتا اس لئے عربی شرح فایق ہے۔
انک گَنت	حساب	عَنَکْث	یکے از اشیائے بسیار وہمجنس کہ اصل وبُن ہمہ اشیاء باشد وبطور کلید بکار آید مراد عدد مفرد سے ہے۔
کالنی پورن	تاریخ	کال نعِیِ بُرہان	کالّ از کل۔ اقوام گزشتہ و ہلاک شدہ نِعِیّ خبر دہندۂ حالات مرگ بُرہان بیان واضح۔
بھوگول	جغرافیہ	بَہو غولّ	بہو زمین فراخ۔ غولّ بمعنی غلولہ یا کرہ مجموعاً کرۂ زمین۔ غولّ کے معنی کتاب خبر دہندہ بھی ہیں۔
چتر دیا	مصوری	صِطر	نگاشتن وبنشتن وِضِحَّہ علم۔
گرہِ نرمان	تعمیر	قِرِیَعْ نارمان	قِرَیع۔ خانۂ فراخ۔ نار۔ پختہ از آہک ساختہ مان از منو دریافتن اندازہ وحقیقت۔
رنجن	رنگسازی	رزّا یارنق	رزّا۔ رنگ کردن۔ رنقاً۔ سیاہ رنگ کردن۔

نام علم	معنی	عربی صورت	شرح عربی
دیپار	تجارت	دیفار	از وفر۔ مال بسیار از ہر قسم مہیا داشتن و داد و ستد کردن آں برائے افزونی۔
سنگیت	موسیقی	سَنِّیت	از سنّ آراستہ شدن و بصورتِ دیگرے برآمدن آراستہ و نیکو کردن سخن را و پائے کوبی۔
تنتوائے	پارچہ بافی	تَنَنْت وَعْیٰ	تنت نیک بافتن۔ وعی یاد کردن و قادر شدن۔
سورن کارتو	زرگری	شوران قرعۃ اُو	شورون۔ سنگِ آتش رنگ کہ بآرایش جمال و لباس بکار برند۔ قرعۃ بآتش تاب دادہ کوفتن او ازادی قایم شدن۔

مترجمین کتب انگریزی کی حوصلہ افزائی کے لئے چند علوم کے یونانی ناموں کو جو انگریزی میں مستعمل ہیں عربی صورت میں لاکر حل کرتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم تغیراتِ السنۂ	فیلالوجی	بلال لوضی	بِلال۔ بوزنِ حساب تغیر السنہ۔ لوضی از لفظ معلّم ض ح متبادل۔ ب پ ف بترتیب متبادل۔
علم تشریح الابدان	فزیالوجی	فَجیَۃ لوضی	از فجو۔ شگاف دادن اعضا جسم را۔
علم کاسۂ سر	فَرینالوجی	فریج ناہ لوضی	فَریج بمعنی سر۔ ناہ از نہی۔ بمعنی کاسہ و ظرف۔
علم الطیور	بیالوجی	بِیاہ لوضی	بیاہ۔ از بوہ۔ بمعنی پرندگان۔
علم طبقات الارض	جیالوجی	جِییَۃ لوضی	جیۃ۔ از جوّ اندرونِ مغاکِ زمین۔ و زمین فراخ۔
علم آثار قدیمہ	آرکیالوجی	آرکیۃ لوضی	ارکیہ۔ بمعنی اشیاء دیرینہ یا قدیم۔
علم نباتات قدیمہ	پلانٹالوجی	بَلَنطَ لوضی	بلنطہ۔ اسم فاعل۔ بلط بمعنی نباتِ قدیم و متحجر۔ اس علم میں زمین میں پرانی دبی ہوئیں نباتات کے متعلق بحث ہے جو پتھر بن گئی ہیں۔
علم تشریح الانسان	انتھراپالوجی	اِنطرافہ لوضی	انطرافہ۔ تشریح جسم انسان و قدامتِ اعضاء۔ اس علم میں ایسے اندرونی اعضاءِ جسم انسان سے بحث ہے جو تمام حیوانات میں زمانہ قدیم سے مشترک یا ہم شکل چلے آتے ہیں۔

یونانی نام کے معنی	یونانی نام	عربی صورت	شرح عربی
علم الاقوام	اتھنالوجی	عطنہ لوضی	عطنہ۔گروہ یا قوم شتربانان۔
تہذیب الاقوام	اتھناگرافی	عطنہ قرافی	عطنہ۔قوم۔قرافی۔لیاقت سزاواری وتمدن۔
علم السنین	کرونالوجی	قردنہ لوضی	قُرُون۔جمع قرن ہائے نسبتی بمعنی ازمنہ۔
قصص وسوانح	ٹریڈیشن	طِراد اِصْ	طِراد۔حکایاتِ جنگہائے سابقہ وجلاوطنی اقوام۔ اصْ مجموعہ۔جمع کے لئے انگریزی میں مستعمل ہے۔
علم ہیئت	اسٹرانومی	اِقتران لومی	اقتران بہم آمدنِ ستارہا دربروجِ فلکی ونظامِ حرکاتِ آنہا۔ اقتران کو یونانی خط میں حرف سی C سے لکھیں تو استران بھی پڑھا جا سکتا ہے لومی۔ ازضی خبردہندہ وبیان کنندہ۔
علم کیمیا	کیمسٹری	قیم اِسطری	قیم۔ازقوم مثل حیل۔ازحول بمعنی قوام معدنیات۔اِسطری۔ ازسطر بہم آوری وحفاظت۔کیمیا قیمیہ ہے۔
تاریخ	ہسٹری	اِسطری	نوشتنِ قصہ ہائے وحفاظت وبہم آوری آنہا۔
افسانہ	سٹوری	سطوری	سَطُوری۔ازسطر افسانہ ہائے بے اصل نوشتن۔

(۱۰)۔انگریزی الفاظ کو عربی صورت پر لانے میں ایک اور دشواری پیش آتی ہے۔ اور وہ انگریزی الفاظ کے تلفظ اور کتابت کا باہمی اختلاف ہے۔ اس کے لئے زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ کتابت پر اعتبار کیا جائے۔ تلفظ مرورِ زمانہ کے سبب سے بہت بگڑ گیا ہے مگر کتابت اکثر اصلی حالت پر قائم چلی آتی ہے۔ مثلاً اپنا ایک تجربہ بیان کرتا ہوں۔ میں جن دنوں میں دوائیوں کے انگریزی ناموں کی فہرست کو عربی سے حل کر رہا تھا۔ ایک دوا کا نام برگنڈی پچ لکھا ہُوا ملا۔ ماہیت کی کیفیت میں لکھا ہُوا تھا کہ ایک درخت کا گوند ہے جو سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں میں ہوتا ہے۔

یہ پہلے سے معلوم تھا کہ برگنڈی فرانس کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ مگر سوئٹزرلینڈ فرانس سے باہر ہے۔ خیال گزرا کہ کہیں سوئٹزرلینڈ کا پرانا نام برگنڈی نہ ہو۔ اس خلجان کو مٹانے کے لئے بارھویں صدی عیسوی کا نقشۂ یورپ دیکھا جو تاریخ یورپ میں درج تھا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ برگنڈی فرانس سے باہر مگر مشرقی حد سے ملحق ہے اور اس کا نام ڈچی آف برگنڈی یعنی ریاست برگنڈی لکھا ہُوا

ہے اور موجودہ علاقہ سوئیٹزرلینڈ معہ اس کے جنوبی علاقہ کے جو سمندر تک پہنچتا ہے۔ کنگڈم آف برگنڈی کے نام سے لکھا ہُوا ہے یعنی سلطنت برگنڈی۔ اور تاریخ سے معلوم ہُوا کہ سوئیٹزرلینڈ زمانہ سابق میں سلطنت برگنڈی کے اندر شامل تھا اور سوئیٹزرلینڈ نام زمانۂ حال میں رکھا گیا ہے۔

دوسرا لفظ پیچ باقی رہا اس کو اس کے مشابہ الفاظ میں بہتیرا تلاش کیا مگر پتہ نہ لگا مجبوراً کتابت انگریزی کو دیکھا تو Patch لکھا ہُوا تھا جس کو علاوہ پیچ کے پیچ، پٹش، پٹکھ۔ بھی پڑھ سکتے ہیں جن کے مشابہ الفاظ مثل فتح۔ فتش، بتج، بطج، بطش وغیرہ سب دیکھ ڈالے مگر کہیں پتہ نہیں آخر پٹکھ کے موافق لفظ فتخ کو دیکھا تو گوند کے موافق معنے نکل آئے۔ تب معلوم ہُوا کہ جس کو پیچ کہا جاتا ہے دراصل فتخ ہے اور کاتب اوّل نے بجز اس کے کہ ف کو پ بنا دیا بالکل صحیح لکھا تھا فقط

قیصری

حقیقت اور انتخاب۔ اس شخص کے لئے جو حقیقت کو دیکھ رہا ہو الفاظ کے انتخاب کی ضرورت نہیں وہ خود اسے بہترین لفظ مہیا کر دیگی۔

"ایمرسن" (شاعری اور تخیل)

شخصیت نہ کہ قابلیت۔ محض قابلیت مصنف نہیں بنا سکتی، کتاب کے عقب میں آدمی ہونا چاہیئے۔

(گوئٹے)

مناسب لفظ اور مناسب محل۔ جہاں بھی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو اپنے مطالب کی حدود سے متجاوز ہو، تو اس لفظ کو خاص طور پر حسن افروز ہونا چاہیئے یا ترنم ریز، کیونکہ ان خصوصیتوں میں سے کوئی ایک صفت انجذابِ توجہ یا ارتفاعِ جذبات کا باعث ہو سکتی ہے۔ لیکن مناسب لفظ کا مناسب محل پر استعمال حسنِ ترنم میں شاید ہی کوئی گنجایش چھوڑتا ہو۔ صحت اور طاقت کا فطری حسن زیوروں کے پُرتصنع حسن سے کہیں زیادہ دلکش و موثر ہوتا ہے۔

(خالد)

لینڈر (آخری پھل)

ہندوستان کی تعلیم

(۱)

تعلیم

تعلیم۔ پڑھنا لکھنا۔ ایک ایسی انسانی اختیاری صفت ہے جس سے آدمی اپنے اصلی معنوں میں انسان بن جاتا ہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی نہ صرف اپنی اور اپنے پاس پڑوس کی خدمت اور بھلائی کر سکتا ہے بلکہ اپنے سے دُور رہنے والے ہمجنسوں کی خدمت اور بھلائی بھی تعلیم کے وسیلہ سے آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اِس سے بھی بڑھ کر تعلیم ایک ایسا اعلیٰ جوہر ہے جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے مرنے کے بعد بھی آنے والی نسلوں کی خدمت اور اُن کی بھلائی کرنے کی قدرت اپنے میں پیدا کر سکتا ہے۔ تعلیم لکھنا۔ پڑھنا۔ اِن فقروں میں مبدأ فیاض کے کرم اور مہربانیوں کا ایسا ناپیدا کنار دریا لہریں مار رہا ہے جو انسان کی پیدائش سے آج تک تمام انسانی نسل کو سیراب کر رہا ہے اور کرتا رہیگا لیکن اس تعلیمی سمندر کا ایک قطرہ بھی کم نہیں ہو سکا اور نہ کم ہو سکتا ہے۔ تعلیم انسان کی چھپی ہُوئی فطرتی قوتوں کو ظاہر کر دیتی ہے۔ تعلیم فطرت کے رازوں سے انسان کو آگاہ کر دیتی ہے تعلیم انسان کو عالی حوصلہ بنا دیتی ہے۔ تعلیم سے انسان میں خودداری اور خود مددی کی روح متحرک ہوتی ہے غرض تعلیم کی ایسی تعریف جو اس چھوٹے سے لیکن نہایت گہرے لفظ پر پورے طور پر حاوی ہو سکے کسی تنہا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ جب سے دُنیا پیدا ہُوئی ہے اور جب سے دُنیا کے حالات معلوم ہُوئے ہیں اُن کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کا سوال ہمیشہ انسانی نسل کے روبرو رہا ہے اور دنیا کے مدبروں نے برابر اس اہم مسئلہ پر غور کیا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے تعلیمی مدبروں نے تعلیم کے سوال پر اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے فائدوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اور اپنی اپنی قومی ضرورتوں کا لحاظ کر کے غور کیا ہے۔ اور اپنے قومی اور مُلکی فائدوں کے مطابق نتیجے پیدا کئے ہیں اور اس طرح سے عام تعلیم کے مسئلہ سے "قومی تعلیم" کا مسئلہ ممتاز ہو گیا ہے ؛

(۲)

قومی تعلیم کا اثر

قومی تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے "عام تعلیم" اور "قومی تعلیم" کا فرق سمجھ لینا چاہیئے۔ "عام تعلیم" میں ہر قسم کی، ہر ملک کی، ہر قوم کی تعلیم شامل ہے بہ خلاف اس کے "قومی تعلیم" اُس خاص تعلیم کو کہتے ہیں جس کا تعلق کسی خاص قوم سے ہوتا ہے۔

تاریخ پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوموں کی عزت اور ذلت قوموں کی آزادی اور غلامی بلکہ قوموں کا عدم اور وجود سب "قومی تعلیم" پر توجہ یا غفلت پر منحصر ہے۔

(۳)

قومی تعلیم اور قومی زبان

قومی تعلیم وہی تعلیم کہی جائے گی جو تمام قوم میں رواج پا جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ایسی کوئی تعلیم "قومی تعلیم"، نہیں کہی جاسکتی جو ایک محدود گروہ میں مروج ہو اور باقی تمام قوم اُس کے فیض سے محروم رہے اس نتیجہ پر پہنچ کر فیصلہ ہوجاتا ہے کہ قومی تعلیم کا مُلکی زبان میں ہونا لازمی اور لابدی ہے۔ اور قومی تعلیم اور قومی زبان کا آپس میں ایسا تعلق ہے جو کسی طرح نہیں چھوٹ سکتا۔ قومی تعلیم کا یہ ہی مطلب ہے کہ قوم کو قومی زبان میں پڑھایا لکھایا جائے۔ ہر خوددار قوم ہر مشہور قوم ہر ایسی قوم جس کے کارناموں سے دنیا کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ہر ایسی قوم جن کی خدمتوں کو دُنیا ہمیشہ بھلائی کے ساتھ یاد رکھیگی اور جس کے مفید نشانات دنیا کے ہر حصہ میں ملیں گے اپنی قومی تعلیم اور قومی زبان کے تعلق کو ایسا اہم سمجھتی آئی ہے کہ ایسی قوم کا صرف دنیوی کاروبار، سلطنتوں کے انتظامات اور روزمرہ کی لکھت پڑھت ہی قومی بولی میں محدود رکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اعلےٰ علوم و فنون کے ساتھ ہی مقدس تحریریں تک بھی اپنی قومی زبان میں محفوظ رکھنا ہر قوم نے اپنا مذہبی فرض سمجھا ہے۔ اور خود اُس پاک ہستی نے جس نے مقدس تحریریں کسی قوم پر نازل کرنا پسند کیں اُن قوموں کی قومی زبان کا اتنا احترام کیا کہ اُسی زبان میں اپنا کلام بھیجا قدیم ایرانی قوم کی الہامی کتاب "ژنداستا" قدیم ایرانی بولی میں" اور مزد یزدان" کی طرف سے نازل ہوئی تھی نہایت

قدیم مصری قوم کی الہامی کتاب پروٹم ہیرو۔ اُس پاک اعلیٰ ہستی۔ نے ٹر۔ کی طرف سے مصری قوم کی اُس زبان میں اوتاری گئی تھی جو مصر کی بہت پرانی عمارتوں کے کتبوں، پرانے شاہی مقبروں، اہرام مصری کی تختیوں اور مصر کے ہزاروں برس پرانے پتھروں اور لوہے کے مناروں پر لکھی ہوئی پائی جاتی ہے جس کے پڑھنے والے دنیا سے نابود ہیں۔ چین کے مقدس رہنما۔ تاؤ۔ اور کنفیوشس کے الہامی صحیفے چینی بولی میں ہیں۔ غرض کہ توریت۔ زبور۔ انجیل۔ وید۔ وغیرہ ہر ایک الہامی کتاب اپنے اپنے متعلق زبانوں میں لائی گئیں۔ یہ واقعات۔ قومی زبان اور قومی تعلیم کے تعلق کو باہم ظاہر کرنے کے واسطے کافی دلیل ہو سکتے ہیں۔

(۴)

قوموں پر تعلیمی زبان کا اثر

تعلیمی زبان کا جو اثر قوموں پر پڑا ہے اور اس سے جو نتیجے نکلے ہیں اُن پر خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ قوموں کے عروج و زوال قوموں کی عظمت اور پستی قوموں کی آزادی اور غلامی بلکہ قوموں کے وجود اور عدم پر تعلیمی زبان کتنا گہرا اور کتنا جلد اثر کرتی ہے۔ اور یہ اثر کتنا دیرپا ہوتا ہے اور کس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ با اقبال قوموں کی تباہی کے حالات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی قوموں کا عروج اُس وقت تک بڑھتا رہا جب تک اُن کی تعلیمی اور ملکی زبان ایک رہی۔ جس وقت کسی باہر کے اثر سے تعلیمی زبان ملکی زبان سے علیحدہ ہو گئی اُسی وقت سے اُن قوموں کی بربادی شروع ہو گئی۔ جنہوں نے اس کا خیال نہیں رکھا بلکہ بعض قومیں تو اس زہریلے اثر کی تاب بھی نہ لا سکیں اور دنیا کے پردہ سے ناپید ہو گئیں۔ کارتھیجیا کی قوم۔ جس کا عظیم الشان تمدن اور حیرت انگیز تاریخ دنیا کے مورخوں کو حیران کئے ہوئے ہے۔ اس قوم کا عروج اُس وقت تک رہا جب تک اُس قوم کی تعلیمی اور ملکی زبان ایک رہی جس وقت اس قوم پر رومن اثر غالب ہو گیا اور کارتھیجیا میں رومن زبان میں تعلیم کی طرف ایک خاص طبقہ کی توجہ شروع ہوئی اُسی وقت سے کارتھیجین قوم کا زوال شروع ہو گیا۔ اور آج وہ قوم اپنی قومیت کو کتنے ہی خولوں میں بدلنے کے بعد تونسی ہیں۔ کارتھیجین قوم کے نام سے نہیں۔ بلکہ عرب قوم کے نام سے فرانس کی غلامی میں اپنے دن پورے کر رہی ہے۔ ایران کی قدیم زبان بولنے والی پرانی ایرانی قوم جس کے جلال و جبروت کا دھندلا سا نشان۔ گماسی ندی کے کنارہ۔ ہمدان کے جنگلوں میں کوہ بیستون کے پہاڑی سلسلہ میں

پتھر کے کھدے ہوئے تاریخی نقش اور تراشی ہوئی تصویروں کے دیکھنے سے اب بھی ذہن میں آجاتا ہے اور جن کی اُس پرانی زبان کے کتبے اب بھی جابجا ایران میں پائے جاتے ہیں۔ جن کے پڑھنے والے بہت کمیاب ہیں۔ گو ایرانی قوم کی تباہی مسلمانوں کی چڑھائی اور قادسیہ کی تاریخی لڑائی سے شمار کی جاتی ہے مگر قومی حالات پر غور کرنے والے سمجھ لیتے ہیں کہ اس نامور ایرانی قوم کا زوال قادسیہ کی جنگ سے کتنی ہی جلدی پہلے اُس وقت سے شروع ہو گیا تھا جب سے کہ سکندر اعظم رومی نے ایران کو فتح کر کے یونانی قوم کے ماتحت کر دیا۔ اور ایران میں پرانی ایرانی زبان کے دوش بدوش یونانی زبان میں تعلیم کی طرف رغبت شروع ہو گئی۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ رفتہ رفتہ ایرانی قوم اپنی قدیم زبان سے علیحدہ ہو گئی اور پرانی ایرانی زبان کے ساتھ ہی ایرانی قوم کی آزادی ہمیشہ کے واسطے جاتی رہی۔ اِسی طرح اگر غور سے دیکھا جائے تو آسیریا کی پرانی تاریخی قوم سریانی زبان کھو کر عدم کے پردہ میں جا چھپی۔ یہ ہی حشر عبرانی بولنے والی قوم کا ہُوا جو نیم غلامی کی صورت میں اپنے سانس پورے کر رہی ہے۔ خود ہندوستان کو لیجئے۔ ہندو قوم نے اپنی قومی تعلیم۔ ویدکی زبان سنسکرت سے جُدا کر لی اس کا اثر دیکھئے کہ ہزاروں برس سے ہندو قوم اپنی قومی آزادی کھو چکی ہے۔ یہ تو بہت پرانی قوموں کا حال اور اُن زبانوں کے متعلق قصے ہیں جو دُنیا سے ناپید ہو چکی ہیں یا ناپید ہو رہی ہیں۔ ذرا بہت قریب کا حال دیکھئے۔ عربوں نے مصر مراکو۔ شام۔ عراق۔ ٹونس۔ الجیریا میں پہنچ کر ان قوموں کی اصلی زبان کی جگہ عربی زبان میں قومی تعلیم جاری کر دی اس کا اثر ظاہر ہے کہ مصر، مراکو، شام، عراق، ٹونس، الجیریا کی اصلی زبان کے ساتھ ہی ان ملکوں کی جداگانہ آزاد قومیت صفحہ ہستی سے فنا ہو گئی۔ اور آج یہ ممالک عربی قوم کی ملکیت ہی نہیں بلکہ قومیت کے لحاظ سے بھی عربی ہی ملک سمجھے جاتے ہیں۔ اسپین کے عرب اپنی زبان کے ساتھ ہی اسپین سے فنا ہو گئے امریکا کے سُرخ باشندوں نے نئے آباد ہونے والے انگریزوں کی زبان کو اپنی قومی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا اور امریکا میں قومی تعلیم انگریزی زبان میں جاری ہو گئی۔ نتیجہ دیکھئے کہ امریکہ کے اصلی سرخ باشندے حسرت سے دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے مُلک پر پردیسی لوگ بلاشرکت غیرے قابض ہیں اور سُرخ باشندوں کی قومیت فنا ہو رہی ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ میں تو ان مُلکوں کے اصلی رہنے والوں کا ستیاناس ہو گیا اور باہر کے لوگ بے غل غش ان ملکوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ ان مثالوں سے تعلیمی زبان کا حیرت انگیز اثر قوموں کے بننے اور بگڑنے پر جو ہوتا ہے وہ صاف معلوم ہو جاتا ہے

اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ہر خوددار ملک میں ہر غیور ملک میں ہر ایسے ملک میں جو اپنی آزادی کی قدر کرتا ہو، ہر ایسے ملک میں جو اپنے کو غلامی سے بچانا چاہتا ہو۔

(۵)

قومی تعلیم قومی زبان میں ہونا لازمی ہے

ہمارے ملک ہندوستان میں موجودہ تعلیم کا اعلیٰ حصہ چونکہ اجنبی بولی میں ہے اس لئے ہندوستان کی مروجہ سرکاری تعلیم قومی تعلیم نہیں کہلائی جا سکتی۔ اور نہ اس درجہ تک پہنچ سکتی ہے کہ اس کو ہم ہندی قومی تعلیم تسلیم کریں +

حاجی محمد موسیٰ خاں۔ دتاولی ضلع علیگڈھ

قومی زبان کی حفاظت ہر وقت اور ہر زمانہ میں سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں کی مقدس امانت اور ایک نہایت ہی اہم استحقاق رہی ہے اور ہے + ہر صاحب علم کو چاہیئے کہ وہ اسے اپنی غیر مختتم توجہ کا مطمح نظر بنائے کہ وہ اپنی زبان کو صاف اور سلجھا ہوا لکھے گا وہ اسے بولے گا اور جہاں تک اس کی طاقت میں ہے اس کے "حسن" اور "کمال" کی حفاظت کرے گا۔ وہ قوم جس کی زبان اکھڑ۔ ناتراشیدہ اور مجہول ہے لازمی طور پر ہر پہلو سے جہالت کے کنگرے پر کھڑی ہے اور کسی وقت ضرور گرے گی + وہ قوم جو اپنی زبان کو بربادی کے ہاتھوں جانے دیتی ہے اپنی دماغی آزادی کے آخری نصف سے دست بردار ہوتی ہے اور دنیا سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جانے کی تمنا کی تصدیق کرتی ہے + (ایک جرمن مصنف) خالد بٹالوی

تحریکِ خیر

۱

پٹنہ میں بیرانام کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک ضعیف، بیکس، خستہ حال، گونڈن رہتی تھی، بھنگی نام تھا۔ اُس کے نہ کوئی اولاد تھی، نہ گھر نہ دوار، نہ جگہ نہ زمین، زندگی کا سہارا صرف ایک بھاڑ تھا گاؤں کے لوگ عموماً ایک وقت چبینہ یا ستو پر بسر کرتے ہی ہیں۔ اس لئے بھنگی کے بھاڑ پر ہمیشہ ایک بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو کچھ بھنائی میں ملتا اُسی کو پیس یا بھون کر کھالیتی اور وہیں بھاڑ کی جھونپڑی کے ایک گوشے میں پڑ رہتی۔ وہ روز سویرے اُٹھتی اور چاروں طرف سے بھاڑ جھونکنے کے لئے سوکھی پتیاں بٹورلاتی۔ بھاڑ کے پاس ہی پتیوں کا ایک انبار لگا رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد اس کا بھاڑ گرم کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ایکادشی یا پورنماشی کے دن رواج کے مطابق بھاڑ نہ گرم ہوتا یا گاؤں کے زمیندار ٹھاکر بیر سنگھ کے دانے بھوننے پڑتے اُس دن اُسے بھوکے ہی سو رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ٹھاکر صاحب کا کام بیگار میں کرنا پڑتا تھا۔ اس بیگار کے علاوہ بھنگی کو اُن کا پانی بھی بھرنا پڑتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس لئے انہیں اس قسم کی خدمت لینے کا پورا حق تھا۔ اسے جبر نہیں کہا جا سکتا۔ جبر صرف اتنا تھا کہ یہ بیگار بالکل سوکھی ہوتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کا خیال تھا کہ اگر مزدوری ہی دے کر کام کرایا تو پھر بیگار کیسی۔ کسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ دن بھر بیلوں کو ہل میں جوتنے کے بعد شام کو بے آب و دانہ کھونٹے سے باندھ دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ اُس کا رحم نہیں، محض اپنی غرض ہے ٹھاکر صاحب کو مزدوری دینے سے تو اصولاً انکار تھا۔ رہی غرض۔ اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو دن بھر بھوکے رہنے سے بڑھیا مر نہیں سکتی تھی، بوڑھے بلا کے سخت جان ہوتے ہیں، موت کی نگاہ بچا کر نکل بھاگنے میں مشاق، ورنہ بوڑھے ہوتے ہی کیوں، دوسرے اگر خدانخواستہ بڑھیا مر بھی جاتی تو اس کی جگہ گاؤں میں دوسرا گونڈ بہت آسانی سے بسایا جا سکتا تھا۔

۲

چیت کا مہینہ تھا۔ اور شنکرانت کے قبل کا دن۔ آج بہار اور دوسرے مشرقی اضلاع میں ستئے

اناج کا ستو کھایا اور خیرات کیا جاتا ہے۔ گھروں میں چولھے نہیں جلتے۔ بھنگی کے بھاڑ کا ہنگامہ خوب گرم تھا۔ بھاڑ کے سامنے ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ گاہکوں کی عجلت پر جھنجھلا پڑتی۔ کیا کروں، دو کے چار ہاتھ بنا لوں۔ کہرا نہ بھنے گا تو مجھی کو گالیاں دو گے۔ کہ اتنے میں ٹھاکر صاحب کے یہاں سے اناج کے دو بڑے بڑے ٹوکرے آ پہنچے، اور حکم ہوا کہ ابھی بھون دے۔ بھنگی ٹوکرے دیکھ کر سہم اٹھی۔ ابھی دوپہر تھا۔ پھر سورج ڈوبنے سے پہلے اتنا اناج بھوننا دشوار تھا۔ گھڑی دو گھڑی اور مل جاتی تو ایک اٹھوارے کے کھانے بھر کو اناج مل جاتا۔ بھگوان سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا۔ ان جم دوتوں کو بھیج دیا۔ اب پہر رات تک مفت بھاڑ میں جلنا پڑے گا۔ اُس پر سینکڑوں چھدّے۔ اناج گھٹ گیا۔ کہرا نہیں بھونا۔ یا بہت کہرا کر دیا۔ دیر لگا دی۔ مایوسانہ انداز سے دونوں ٹوکرے رکھوا لئے۔

چپراسی نے تند لہجہ میں کہا۔ دیر نہ لگے۔ نہیں تو تم جانو گی،

بھنگی۔ یہیں بیٹھے رہو۔ جب سب دانہ بھن جائے تو لے کر جانا۔ اگر کسی دوسرے کا اناج چھوؤں تو ہاتھ کاٹ لینا۔

چپراسی۔ ہمیں بیٹھنے کی مہلت نہیں ہے۔ لیکن تیسرے پہر تک دانہ بھن جائے۔

چپراسی تو یہ تاکید کر کے رخصت ہوا اور بھنگی د. نے بھوننے لگی۔ دوسرے گاہک تکرار کرنے لگے۔ ہم دو گھنٹہ سے کھڑے ہیں۔ ہمارا دانہ نہیں بھونا۔ اب کل ستو کیسے بنے گا؟

بھنگی نے چڑھ کر کہا "میں کیا کروں۔ جمدار کا اناج نہ بھونوں تو رہوں کہاں، تمہارے منہ نہیں تھا۔ چپراسی سے کیوں نہ کہا اتنا اناج تو تم اکیلے دئے جاتے ہو۔ ہمارا اناج کون بھونے گا؟

لاچار لوگوں نے اپنی اپنی چھبڑیاں اٹھائیں اور چلتے ہوئے۔ بھنگی فدائیانہ جوش کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ مگر من بھر سے زیادہ اناج بھوننا کوئی دل لگی تو تھی نہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں بھوننا چھوڑ کر بھاڑ بھی جھونکنی پڑتی تھی تاکہ تاؤ ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔ تیسرا پہر ہو گیا اور ابھی آدھا اناج بھی نہ ختم ہوا۔ وہ ڈری کہ کہیں زمیندار کے آدمی آتے ہوں۔ آتے ہی گالیاں دینے لگیں۔ بھاڑ پھوڑنے لگیں اور تیزی سے ہاتھ چلانا شروع کیا۔ ایک نگاہ دروازے کی طرف تھی، دوسری نا ند کی طرف یہاں تک کہ بالو ٹھنڈا ہو گیا اور دانہ سیوڑا نکلنے لگا۔ لوہے کا نازنی چمچہ چلاتے چلاتے دونوں

ہاتھ شل ہو گئے۔ مصیبت کا سامنا تھا۔ اپنی بیکسی پر رونے لگی۔ نہ جانے نارائن کہاں بھول گئے ساری دُنیا مرتی ہے۔ مجھے موت بھی بھُول گئی۔ جس کی یہاں دُرگت ہے اُسے کوئی وہاں بھی نہیں پوچھتا۔ کون میرے آنسو پونچھتا ہے اپنا خون جلاتی ہوں تو کہیں دانہ میسر ہوتا ہے، لیکن جب دیکھو سر پر سوار۔ اسی لئے نہ کہ ان کے گاؤں میں رہتی ہوں۔ ان کی چار انگل دھرتی پر میرا نباہ ہو رہا ہے۔ ایسی کتنی زمین گاؤں میں پڑی ہُوئی ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے گھر اُجڑے ہُوئے ہیں۔ وہاں تو کیسر نہیں ہوتی۔ پھر مجھی پر آٹھوں پہر یہ دھونس کیوں رہتی ہے۔ کوئی ذراسی بات ہوتی ہے تو یہی دھمکی ملتی ہے کہ بھاڑ کھود کر پھینک دوں گا۔ اُجاڑ دوں گا۔ میرے سر پر بھی کوئی ہوتا تو کیوں یہ دھکے سہنے پڑتے۔

وہ انہیں خیالوں میں ڈوبی ہُوئی تھی کہ زمیندار کے دونوں چپراسیوں نے آکر پوچھا، اناج بھن گیا؟ بھُنگی نے بے خوف ہو کر کہا۔ بھُن تو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔

چپراسی۔ سارا دن گذر گیا اور تجھ سے اتنا اناج نہ بھُونا گیا۔ اور تو یہ بھُون رہی ہے کہ اناج کا ستیاناس کر رہی ہے۔ یہ تو بالکل سیوڑے ہیں۔ ان کا ستو کیسے بنے گا۔ دیکھ تو آج ٹھاکر تیری کیا دُرگت کرتے ہیں

نتیجہ یہ ہُوا کہ اُسی رات کو بھاڑ کھود کر پھینک دیا گیا۔ اور حرماں نصیب، آفت زدہ بڑھیا کا کوئی سہارا نہ رہا۔

۳

بھُنگی کی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ گاؤں والوں کو بھی بھاڑ کے بغیر تکلیف ہونے لگی۔ کتنے ہی گھروں میں تو دوپہر کو دانہ ہی نہ میسّر ہوتا۔ لوگوں نے جا کر ٹھاکر صاحب سے سفارش کی کہ بڑھیا کو بھاڑ جلانے کا حکم دیدیجئے لیکن ٹھاکر صاحب نے پروا نہ کی۔ بولے یہ شیطان کی خالہ ہے۔ نہ جانے کس گھمنڈ میں بھُولی ہُوئی ہے۔ بھُوکوں مریگی تو سیدھی ہو جائے گی۔ میرا من بھر دانہ چوپٹ کر کے رکھ دیا۔ سمجھتی ہو گی ٹھاکر میرا کیا لیں گے۔ یہ نہیں جانتی کہ ٹھاکر ہی کی بدولت چین کی بنسی بجاتی ہوں۔

ٹھاکر صاحب کی یہ مردانہ باتیں سُن کر لوگ لوٹ آئے۔

ایک اسامی نے کہا۔ اس مرے مُردے پر کیا تاؤ دکھاتے ہیں۔ کسی مرد سے ہاتھ ملاتے تو

معلوم ہوتا۔

دوسرا بولا۔ ان کی ٹھکرائی غریبوں کو پیسنے ہی میں رہ گئی ہے۔ سرکاری پیادوں کو دیکھ کر تو کانپنے لگتے ہیں، مردوں کے منہ کیا آئیں گے۔ ہاں ہم لوگ ان کے گاؤں میں بسے ہیں جو چاہیں کریں۔

کئی دن تک تو بھنگی جوں توں کر کے بسر کرتی رہی۔ سنکرانت کے دن اناج زیادہ مل گیا تھا لیکن جب وہ اناج خرچ ہو گیا تو فاقے کرنے لگی۔ کئی آدمیوں نے سمجھایا تیرا اس گاؤں میں کیا رکھا ہے کیوں کسی دوسرے گاؤں میں نہیں چلی جاتی۔ ہم وہاں چل کر تیرا بھاڑ بنوا دیں گے۔ تیرے رہنے کو ایک جھونپڑی بھی اُٹھا دیں گے۔ آرام سے رہنا۔ سب زمیندار ایسے ہی تھوڑے ہیں۔ مگر بڑھیا نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ اس گاؤں میں اس نے اپنی مصیبت کے پچاس برس کاٹے تھے۔ یہاں کے ایک ایک پیڑ پتے سے اُسے محبت ہو گئی تھی۔ یہاں وہ بچے بچے کو جانتی تھی۔ بچّہ بچّہ اُسے جانتا تھا سارا گاؤں اپنا گھر معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے سُکھ دُکھ سب اسی گاؤں میں جھیلے تھے۔ اب آخری وقت میں اس سے کیونکر ناتا توڑے۔ اس خیال ہی سے اُسے قلق ہوتا تھا۔ دوسرے گاؤں کے سُکھ سے یہاں کا دکھ بھی پیارا تھا۔

اِس طرح ایک پورا مہینہ گذر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر بیر سنگھ اپنے دو تین پہرا سیوں کو لئے لگان وصول کرنے جا رہے تھے۔ کارندوں پر اُنہیں اعتبار نہ تھا۔ نذر نذرانے میں، حق دستور میں، وہ کسی غیر کو شریک نہ کرنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی کہا کرتے زمینداری میں کیا رکھا ہے۔ سرکاری مطالبہ اور عدالت کے خرچ نکال کر سینکڑے میں دس روپے بھی نہیں بچتے۔ اب تو جو کچھ ہے وہ یہی اوپری رقم ہے۔ اسی پر یہ سارا ٹھاٹ بنا ہُوا ہے۔ غرور کی نگاہوں سے ادھر اُدھر تاکتے۔ اسامیوں کے سلاموں کا تبسّم سے جواب دیتے چلے جاتے تھے۔ کتنا رُعب تھا، کتنی تعظیم، عورتیں انہیں دیکھتے ہی جھٹ گھونگھٹ بڑھا کر منہ پھیر لیتی تھیں۔ دروازوں پر بیٹھے ہُوئے لوگ گھبرا کر کھڑے ہو جاتے تھے کوئی اپنی پگڑی سنبھالنے لگتا۔ کوئی اپنا ناریل آڑ میں رکھ آتا تھا۔ اس شان سے گاؤں کا چکر لگاتے ہُوئے وہ بھنگی کی بھاڑ کی طرف سے گذرے۔ اُدھر تاکنا تھا کہ بدن میں آگ لگ گئی۔ بھاڑ کی از سر نو تعمیر ہو رہی تھی۔ بڑھیا مٹی کے لوندے اُٹھا اُٹھا کر بڑی تیزی سے رکھ رہی تھی۔ شاید اُس نے کچھ رات رہتے ہی کام میں ہاتھ لگا دیا تھا اور طلوعِ سحر سے پہلے ہی اُسے ختم کر دینا چاہتی

تھی۔ آج دیوی کی پوجا تھی۔ رواج کے مطابق اُنکی چبوترے پر گاؤں کی کنواری لڑکیوں کو ستو کھلایا جانے والا تھا۔ بڑھیا نے اس تقریب کے لئے ہمیشہ اپنے بھاڑ میں دانہ بھونا تھا۔ اس کی مزدوری وہ کچھ نہ لیتی تھی۔ اگر آج بھاڑ نہ تیار ہوگیا تو دانہ کون بھونے گا؟ کسی دوسرے گاؤں سے دانہ بھن کر لایا گیا تو کہیں دیوی جی ناراض نہ ہوجائیں۔ نہ جانے گاؤں پر کیا آفت آئے۔ ٹھاکر بگڑینگے۔ کوئی پروا نہیں۔ دیوی تو خوش ہونگی۔ ٹھاکر بگڑینگے تو بہت کرینگے میرا بھاڑ پھر کھدوا دیں گے۔ دیوی بگڑینگی تو گاؤں کی خیریت نہیں۔ اور پھر ٹھاکر صاحب بھی تو دیوی کے بھگت ہیں۔ وہ ایسی جرات کیسے کرینگے؟ دیوی سے تو راجہ بھی ڈرتا ہے۔ ٹھاکر کی کون گنتی۔ ان خیالوں نے بڑھیا کو بھاڑ کی مرمت پر آمادہ کیا تھا۔ وہ اپنے کام میں ایسی محو تھی کہ ٹھاکر صاحب کے آنے کی بھی اُسے خبر نہ ہوئی۔ دفعتہً اسکے کان میں آواز آئی۔ کس کے حکم سے؟

بھنگی نے چونک کر سر اُٹھایا تو ٹھاکر صاحب کھڑے تھے۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔

ٹھاکر صاحب نے پھر وہی سوال کیا۔ کس کے حکم سے؟

بھنگی نے دلیرانہ انداز سے جواب دیا: دیوی جی کے حکم سے،

ٹھاکر۔ اس گاؤں کا مالک میں ہوں۔ دیوی نہیں۔

بھنگی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا ٹھاکر ایسی بات مُنہ سے نہ نکالو۔ دیوی سنسار کی مالک ہیں ہم تم کس گنتی میں ہیں؟

ٹھاکر۔ (چپراسیوں سے) کیسی چگھڑ بڑھیا ہے۔ دیوی کا خوف دلا کر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ گرا دو اس کے بھاڑ کو،

چپراسیوں میں کسی کو اس حکم کی تعمیل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ٹھاکر صاحب کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ چپراسیوں کو نمکحرام اور ڈرپوک کہتے ہوئے گھوڑے سے اُتر پڑے اور بھاڑ میں زور سے ایک ٹھوکر ماری۔ مٹی گیلی تھی۔ سب کچھ لئے دیئے بیٹھ گئی۔ دوسری ٹھوکر ناند پر چلائی لیکن بڑھیا سامنے آگئی۔ ٹھوکر اس کی کمر پر پڑی۔ اوندھے منہ گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اُڑنے لگیں۔ اب اسے غصہ آیا۔ کمر سہلاتی ہوئی بولی۔ ٹھاکر۔ تمہیں آدمی کا ڈر نہیں ہے تو دیوی دیوتا کا ڈر تو ہونا چاہیئے۔ مجھے اس طرح اُجاڑ کر کیا پاؤگے؟ کیا اس چار انگل دھرتی میں سونا نکل آئیگا۔ میں تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ گریب کی ہائے بڑی ہوتی ہے۔

میرا دل مت دُکھاؤ۔
ٹھاکر۔ اب تو یہاں پر بھاڑ نہ بنائیگی؟
بھنگی۔ بھاڑ نہ بناؤنگی تو کھاؤنگی کیا؟
ٹھاکر۔ تیرے پیٹ کا ہم نے ٹھیکہ لیا ہے؟ گاؤں چھوڑ کر نکل جا۔
بھنگی۔ کیوں نکل جاؤں؟ بارہ سال کھیت جوتنے سے آسامی کاشتکار ہوجاتی ہے۔ میں تو اسی جھونپڑی میں بوڑھی ہوگئی۔ میرے ساس سسر اور اُن کے باپ دادے اسی جھونپڑی میں رہے۔ اب جم راج کو چھوڑ کر مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا،
ٹھاکر۔ اچھا تو اب تو قانون بھی بگھارنے لگی۔ ہاتھ پیر جوڑتی تو چاہے رہنے بھی دیتا۔ لیکن اب تجھے نکال کر ہی دم لونگا۔ (چپراسیوں سے) ابھی جاکر اس کے پتوں کی ڈھیری میں آگ لگادو دیکھیں اب کیسے بھاڑ جلاتی ہے،

بھنگی نے کہا۔ آج دیوی کی پوجا ہے۔ بھاڑ جلانے دو۔ کل جو جی میں آئے کرنا۔
ٹھاکر۔ تیرا ہی ایک بھاڑ نہیں ہے۔ دوسرے گاؤں میں بھی بھاڑ گرم ہوتے ہیں۔

۴

ایک لمحہ میں شعلے اُٹھنے لگے۔ اُنکی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں لپٹیں کسی دیوانے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ سارے گاؤں کے لوگ اُس کوہ آتشیں کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ بھنگی اپنے بھاڑ کے پاس غمناک بیٹھی ہوئی یہ دلسوز نظارہ دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آرہے تھے۔ مجھ پر اتنا غصہ! اسی ابھاگے پیٹ کے لئے اتنی مصیبت۔ دھتکار ہے ایسی جندگانی پر۔ کون کوئی میرے آگے پیچھے بیٹھا ہوا ہے کہ یہ سب اندھر سہ کر بھی جیتی رہوں۔ اب سہارا ہی کیا ہے۔ بھاڑ ہی ٹوٹ گیا۔ پتیاں جل ہی گئیں۔ کیا بھیکھ مانگ کر پیٹ پالوں۔ اتنی عمر بیت گئی۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اب کے دن کے لئے یہ دھکے سہوں یہ سوچتے سوچتے بڑھیا رونے لگی۔ ناکامی اور یاس کا غلبہ اور بھی زیادہ ہوا۔ سر پر ایک جنون سا سوار ہوگیا۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور دھکتے ہوئے شعلوں میں گھس گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آگ کے

مُنہ میں جائے۔ ٹھاکر صاحب گھوڑے پر سوار یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی بڑھیا شعلوں میں گھسی وہ بجلی کی طرح گھوڑے سے کودے اور دم زدن میں ہوا کی طرح شعلوں کے اندر داخل ہو گئے۔ ساری خلقت دم بخود، ہراس اور دحشت کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ ٹھاکر صاحب بھُنگی کو گود میں لئے آگ سے باہر نکلے۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ بھُنگی کے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھی۔ لوگوں نے اپنے کمل اُتار اُتار کر اُنہیں اوڑھا دیئے۔ بھنگی کی جان کی کسی کو پروا نہ تھی۔ سب کے سب ٹھاکر صاحب کی جان کی خیر منا رہے تھے۔ خیریت یہ تھی کہ اُنہیں آگ سے کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ صرف کہیں کہیں جلد پر آنچ آگئی تھی۔ مگر بڑھیا کا سارا جسم جھُلس گیا تھا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ شعلے ابھی تک دہک رہے تھے اور ٹھاکر صاحب بڑھیا کو گود میں لئے اُس کی جلن کو اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ کوئی بڑھیا کو پنکھا جھلتی تھی۔ کوئی اس کے جسم پر مسکے کا لیپ کر رہی تھی۔ اور لوگ بھی اپنے اپنے دیہاتی ٹٹکے کام میں لا رہے تھے۔

دفعتہً ٹھاکر صاحب نے کہا "کسی کو شہر بھیجدو ابھی ڈاکٹر کو بلا لائے"

ٹھکرائن نے کہا۔ انہیں دیہاتی لٹکوں سے اچھی ہو جائیگی۔ ڈاکٹر کو بُلا کر کیا ہوگا،

ٹھاکر۔ اگر وہ مر گئی تو میں زہر کھا لوں گا،

ٹھکرائن۔ اب وہ نہ مرے گی۔

ٹھاکر۔ (جوش سے) ہاں اگر میرے امکان میں ہے تو اب وہ اس صدمے سے نہ مریگی اپنی موت سے مریگی۔

۵

ٹھاکر بیر سنگھ اپنے علاقہ میں بہت نیکنام نہ تھے۔ اس واقعہ نے اُنہیں منظور خاص و عام بنا دیا۔ اسامیوں نے بالعموم ان کی جانبازی کی تعریف کی۔ مگر زمینداروں نے اسے نوری جنون سمجھا۔ ایک بڑھیا کے لئے آگ میں کودنا فضول تھا۔ اُس کے مر جانے سے کون سنسار سونا ہُوا جاتا تھا۔ کوئی اس کے نام کو رونے والا بھی تو نہ تھا۔ ہاں آپ مر جاتے

تو البتہ خاندان بے چراغ ہو جاتا۔

ایک مہینہ گذر گیا تھا۔ بھُنگی ٹھاکر صاحب کے مکان میں لیٹی ہُوئی تھی۔ بیر سنگھ اسکے سرہانے بیٹھے ہُوئے تھے۔ دفعتہً بھُنگی نے کہا، بھیّا اب تو میں اچھی ہو گئی۔ مجھے اپنا بھاڑ کیوں نہیں جھونکنے دیتے۔ یہاں کب تک پڑی رہونگی۔ بہت دن تو ہو گئے،

بیر سنگھ نے کہا "بھنا جی رو ب گیا۔ کوئی تکلیف ہے؟

بھُنگی۔ ہاں بھیّا جی کیوں نہ رو بے گا۔ دودھ اور حلوا کھانے اور آٹھوں پہر پان کی طرح پھیرے جلانے سے کس کا جی نہ رو بے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کون تکلیف ہو گی! کیوں بھیّا۔ جب تم میرے پیچھے آگ میں گھُسے تمہیں ڈر نہ لگا۔ یہ بھی نہ سمجھا کہ ایک بڑھیا کے لئے کیوں اپنی جان جوکھم میں ڈالوں۔ میں بہت سوچا کرتی ہوں کہ اُس گھڑی تمہارے من میں کیا بات آئی،

ٹھاکر۔ میں نے کچھُ نہ سوچا سمجھا۔ مجھے تو جیسے ایک نشہ سا آگیا۔ میں آپے میں نہ تھا۔ خود بخود میرے پیر آگ کی طرف دوڑے۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، کیوں جاتا ہوں۔ کچھُ بھی ہوش حواس نہ تھا۔ سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا۔ ایشور کو مجھے کلنک سے بچانا منظور تھا۔ اور کیا +

پریم چند

سب سے محبت کرو اور بہت کم پر اعتماد، لیکن کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرو۔　شکسپیئر

دُنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں، سب اپنی اپنی جگہ کارآمد ہیں۔　"لونگ فیلو"

ان لوگوں کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے جن میں صبر نہیں　"شکسپیئر"

اگر تم اپنی زندگانی کو خوشی اور شادمانی کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہو تو صلح پسند بنو　"تھیکرے"

(خالد)

بے صبروں کا دوزخ

میرے دوست یقین نہیں کرتے۔ میرے ذاتی تجربہ کو وہ افسانہ نویسی بیان کرتے ہیں۔ ناچار پبلک کو منصف قرار دیتا ہوں۔ تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے دوست بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں دروغ گو ہوں۔ دشمن تو واقعی مجھے راستباز خیال اور بیان کرتے ہیں کیونکہ محض از روئے بغض میں انہیں کبھی موقع نہیں دیتا کہ وہ مجھے عملاً یا قولاً جو فروش گندم نما ظاہر کر سکیں۔ یہ واقعی میری کمزوری ہے کہ میں ہمیشہ دشمنوں کی عداوت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہوں اور دانستہ انہیں "مجھے جھوٹا" ثابت کرنے کی خوشی سے محروم رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ دشمنوں کی خاطر چند عیوب کو اچھی طرح سے پالے تاکہ ان کو جھوٹی تہمت لگانے کے فضول عیب سے بچائے یسوعؑ مسیح کا قول ہے کہ "دشمن سے محبت کرو" اور محبت اصلی اور سچے معنے میں یہی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی اخلاقی عظمت کا پورا خیال رکھا جائے۔ دشمن سے محبت کرنے کے یہی معنے ہیں کہ اپنے میں وہ برائیاں پیدا کرو جو تمہارا دشمن چاہتا ہے کہ تم میں ہوں تاکہ وہ تم کو بغیر جھوٹ بولنے کے بدنام کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت قائم رہے۔ میں یہ نہیں کرتا اور یہ بخل میرا طبعی ہے اور میں اللہ جل شانہ سے ہزار بار دعا کر چکا ہوں کہ میری طبیعت سے یہ بخل کم ہو مگر نہیں ہوتا۔ ہاں مگر دوستوں سے میں نے کبھی اس قسم کی پردہ بازی نہیں کی۔ پھر وہ مجھے کیوں صادق تصور کرتے ہیں؟ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر اس قدر ذلیل ہو گیا ہوں کہ دوستوں سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ گویا ان سے بھی دشمنی کرتا ہوں۔ مگر یہ غنیمت ہے کہ میرے دوست اس قدر میرے محرم راز ہیں کہ ان کو میرے بیسیوں اور عیوب معلوم ہیں۔ اور اس لئے وہ برسرِ پرخاش نہیں ہوتے۔ بلکہ کیا تعجب ہے کہ وہ میری راستبازی کو ایک قسم کا مرض تصور کرتے ہوں۔ اور اس لئے چنداں معترض نہ ہوں۔ ایشیا میں جہاں اور امراض کا زور ہے یہ بھی بمنزل نیل پائی کسی کسی شخص میں موجود ہے گو عام نہیں اور ممکن ہے کہ میں بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ آخر میں یورپین تو نہیں۔ ہوں تو وہی کالا آدمی۔ خیر آمدم برسرِ مطلب۔

۱۹۱۸ء کے انفلوانزا کی وبا کی اعداد شماری پر میرا بھی احسان ہے۔ صرف اعداد شماری میں ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر پروری میں بھی میں نے حصہ لیا۔ بہت سے لوگ ضرور ایسے تھے کہ جنہوں نے اس نادر موقع پر بھی خسّت سے کام لیا اور جو ڈاکٹروں کو فیس دئے بغیر چل دئے یا اس سے بدتر کہ فیس دئے بغیر اچھے ہو گئے۔ ڈاکٹر حق بجانب ہونگے اگر انہیں کبھی معاف نہ کریں مگر میں اِس زمرہ میں نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا پورا علاج کیا۔ میں سخت احسان فراموش ہونگا۔ اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کروں مگر مرض کو دوا سے ضد تھی۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" انفلوانزا سے ڈبل نمونیا ہُوا۔ تھوک سفید سے گلابی۔ گلابی سے گلنار۔ سانس ایک کی بجائے چار۔ غذا بند۔ غشوں کا انبار۔ سب کچھ ہُوا۔ ساتھ والے کمرے میں صنفِ نازک کا ایک لاجواب نمونہ اپنے انفلوانزا کے باعث نہیں بلکہ میری بُری حالت کی خبر کی وجہ سے جاں بحق ہُوئی۔ جیسا کہ مشہور ہونا چاہیئے تھا مشہور ہو گیا کہ میں مر گیا ہوں۔ فرشتوں نے بھی غالباً باہر سے ہی سُنا اور وہ میرے ہی کمرے میں داخل ہُوئے فرشتے اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ جنگ یورپ کے تھکے ہُوئے۔ لاشیں گھسیٹتے گھسیٹتے چور ہو چکے تھے۔ اگر جلدی میں ایک کمرے کی بجائے دوسرے میں داخل ہو گئے تو کیا تعجب۔

ایک نے میری روح سے کہا چل، روح تھر تھر کانپتی ہُوئی نکلی۔ ایک نے اس طرف ایک نے اُس طرف سنبھالا۔ تھوڑی دُور جا کر روح کو پھر انہوں نے ایک عجیب قسم کا جسم پہنایا اور آناً فاناً اس میرے پُرانی رُوح والے نئے جسم کو ایک عالیشان عمارت کے بیرونی کمرے میں داخل کر دیا۔ روح نکالنے والے فرشتے چلدیئے۔ اس کمرے میں اور بھی میری جیسی بیسیوں ہستیاں تھیں۔ مگر سب خاموش۔ اتنے میں چند محافظ داخل ہُوئے اور ہم سب کو ہانک کر لے گئے۔ ایک محافظ نے دوسرے سے کہا کہ ہاں یہ سب ساتویں طبقے والے ہیں۔ میں اپنی کرتوتوں سے واقف تھا۔ کچھ متعجب نہ ہُوا۔ سمجھ گیا کہ جہنم کا ساتواں طبقہ میری رہائیش کے لئے موزوں خیال کیا گیا ہے۔ کسی حد تک خوشی ہوئی کہ غنیمت ہے کہ گیارھواں نہیں یا اکیسواں نہیں۔ گو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کُل کتنے طبق ہیں مگر خود پسندی نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ یہی جی میں آیا کہ مجھ سے ہزاروں اور بدتر ہونگے اسی لئے تو مجھے ساتواں طبقہ ملا ہے۔ آناً فاناً ساتویں طبقہ کے دروازہ

پر پہنچ گئے۔ (جہنم کے کارندے بلا کے پھرتیلے ہیں۔ رستہ بھی نہ دیکھنے دیا اور جھٹ لے کر پہنچ گئے) وہاں ایک ایک کا جائزہ لیا گیا۔ میرا نمبر سب سے اخیر تھا۔ باقی تو سب داخل کئے گئے۔ مگر میرے داخلہ کے وقت کچھ آپس میں ان محافظوں کے اشارے ہوئے جس سے میں یہ سمجھا کہ کچھ غلطی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک اخیری اشارے سے جس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں "یہاں کا نہیں" مجھے نکالا گیا۔ اب مجھے ایک ایسی جگہ لایا گیا جو میرے خیال ناقص میں جہنم کا Enquiry office تھا یہاں جب تلک کہ وہ رجسٹر دیکھیں مجھے اِدھر اُدھر تاک جھانک کا موقع ملا۔ کوئی ایسی انوکھی بات نظر نہ آئی۔ بھیڑ تھی۔ متوحش بھیڑ تھی۔ مگر اس قسم کی بھیڑ بہت دفعہ ریل کے اسٹیشنوں پر درجہ سوئم کے داخلہ پر میں دیکھ چکا تھا۔ محافظوں کے چابک اپنا کام کر رہے تھے مگر آہ و بکا کچھ نہ تھی۔ سب ہستیاں صرف اس سراسیمگی میں تھیں کہ ہم کہیں رہ نہ جائیں۔ شاید اس حصۂ جہنم کی یہی مقررہ سزا ہو کہ انسان سفر کی سراسیمگی میں ابدی طور پر گرفتار رہے۔ ریل سامنے۔ ٹکٹ پاس مگر داخل ہونا نہیں ملتا۔ چابکوں کی جسمانی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کیونکہ روحانی خوف طاری ہے کہ ریل کہیں چل نہ دے۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا رفیق نہیں۔ مددگار نہیں پرساں حال نہیں۔ پیچھے سے دھکیلے جا رہے ہیں۔ آگے سے پیچھے گھسیٹے جا رہے ہیں۔ گٹھریاں۔ لاٹھیاں ڈاڑھیاں۔ پگڑیاں۔ دوپٹے۔ آنکھیں سب خلط ملط ہو رہی ہیں۔ انسانی اضطراب کی واقعی خوفناک تصویر تھی اور بہت سخت سزا۔ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دفتر کے کسی بڑے صاحب نے کسی ماتحت کو کہا "ڈیم۔ ڈیم فول۔ بہشت کا بچہ (یہ شاید وہاں کی گالی ہو)۔ نکالو۔ بے صبر لوگ کے دوزخ میں لے جاؤ"

چنانچہ میں اس دفتر سے نکالا گیا۔ مجھے نکالتے نکالتے بابو صاحب نے کچھ اور بھی نکالا۔ یعنے اپنا غصہ۔ ایک لات۔ دو مُکّے۔ اور کئی زبانی تبرکات۔ میرے حصے میں آئے۔ باقی دفتر کے چپراسیوں میں بٹے۔ مگر اس لکد کوبی میں بلا کی تاثیر تھی۔ میں دھواں دھار خلا میں سے لڑھکتا ہُوا۔ قلابازیاں لگاتا ایک عمارت کے دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ میں سر پہلے پاؤں پیچھے لڑھکتا ہُوا دروازہ میں داخل ہُوا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ از غیب ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ انفلوانزا سے پہلی زندگی میں میں ترقی کے لئے

ہمیشہ بے صبر رہتا تھا۔ چنانچہ اس کاغذ پر صرف یہ لفظ لکھے ہوئے تھے۔

تمہاری ترقی ہوگی

مگر سکنڈ سکنڈ میں یہی فقرہ بدل کر یوں ہو جاتا تھا۔

ابھی نہیں

میری وہ روحانی ایذا قابل بیان نہیں جب کہ ترقی ہوگی، والا فقرہ پل پل میں بدل کر "ابھی نہیں" ہو جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میری دائمی سزا ہے۔ کوئی الفاظ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ سزا میرے لئے کتنی بڑی تھی۔ یا یہ کہ انصاف الٰہی نے کس قدر موزون سزا میرے لئے تجویز کی۔ "ہوگی" "ابھی نہیں"۔ "نہیں"۔ "ہوگی" "نہیں" "ابھی نہیں" کوئی دوزخ ان سیدھے سادھے دو تین لفظوں کے بار بار بامر مجبوری پڑھنے اور محسوس کرنے سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اگر میرا بس چلتا تو اپنی اِس بے صبر شخصیت کو سو سو طرح سے قتل کرتا جس نے مجھے یہ روز بد دکھایا کہ ہمیشہ کے لئے "ہوگی" "نہیں ہوگی" کے چکر میں گرفتار رہوا۔ رنج۔ غصہ۔ پشیمانی گھٹا باندھ باندھ کر میرے قلب پر حملہ کرتے تھے۔ "ہوگی" "نہیں ہوگی" کے تازیانے میری روح کی کھال ادھیڑے ڈالتے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوا کہ ہزاروں سال مجھے یہ سزا ملی ہے مگر ایکبارگی آسمان سے شعلہ سان ایک پنجہ گرا اور مجھے اُٹھا کر چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کا مجھے پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ مگر آخر مجھے ہوش آیا اور میں ایک نئی قسم کی عمارت میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم مجھے مل گیا ہے۔ ابھی اور کچھ دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک نہایت شاندار بزرگ اس کمرے میں وارد ہوئے۔ فرمانے لگے۔

"مسٹر — مجھے آپ سے ایک غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں ملک الموت ہوں۔ میرے کارندوں نے آپ کو اُٹھا لانے میں غلطی کی۔ آپ کو قبل از وقت جو تکلیف ہوئی وہ آپ معاف کریں۔ چلئے اپنے گھر"

میں۔ جناب۔ کیا یہ آپ کا دولت خانہ ہے؟

ملک الموت۔ نہیں۔

میں۔ بہت بہتر۔ پھر آپ تشریف لیجائیے۔ میں آپ کو غلطی معاف کرتا ہوں۔ مگر میں واپس

جانا نہیں چاہتا۔ مجھ سے پھر کوئی بے صبری کی بات ہو جائے گی اور میں بے صبروں کے دوزخ میں اب دوبارہ جانا نہیں چاہتا۔ میں اسی جگہ رہوں گا۔ یہ مجھے پسند ہے۔ صاحب خانہ اگر نکالینگے تو میں نکل جاؤں گا۔

ملک الموت ۔ یہ ضد اچھی نہیں۔

میں ۔ ضد جناب کی طرف سے ہے کہ جاؤ اپنے گھر۔ میری طرف سے کوئی ضد نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کن صاحب کا مہمان ہوں۔ جب آپ کا یہ گھر نہیں تو آپ بھی مہمان ہیں۔ ایک مہمان کو دوسرے مہمان کے نکالنے کا حق تو کبھی نہیں سُنا۔

ملک الموت ۔ اچھا میں صاحب خانہ کو بُلاتا ہوں۔

اتنے میں ایک شاندار مگر نہایت ہی پیاری صورت والے بزرگ وارد ہوئے۔ اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

" مسٹر ۔۔ آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس سے میں قریباً مجبور ہو جاتا ہوں بالخصوص اس لئے کہ آپ حتی الامکان مہمان نواز ضرور ہیں مگر میرے اختیارات بہت محدود ہیں۔ میں فرشتوں کے کام کا نگران ہوں۔ اگر کوئی سہو ہو جائے تو اسے درست کرنا میرے سپرد ہے۔ آپ کے متعلق محض سہواً کچھ کارروائی عمل میں آئی جسے درست کرنا میرا فرض تھا چنانچہ میں آپ کو دوزخ سے نکال لایا۔ مگر یہاں میں آپ کو رکھ نہیں سکتا۔

میں ۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ خود مجھے یہاں لائے۔ لازمی طور پر میں آپکا مہمان ہُوا۔ آخر مہمان کا آپ کے ہاں کم سے کم حق کیا ہے ؟ میں ناکارہ سہی مگر اس کم سے کم حق سے تو محروم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی شفقت سے بعید نہ ہو گا اگر مجھے اس حق سے فیضیاب ہونے دیں۔

نگران فرشتہ ۔ میں آپ کو صرف اتنے وقت تک رکھ سکتا ہوں جو آپ کی زبان میں تین دن سمجھا جاتا ہے۔

میں ۔ مگر اس عرصے میں مجھے آپ بہشت و دوزخ کی سیر تو کرا سکتے ہیں۔

نگران فرشتہ ۔ بہشت کی ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہاں کے کام میں سہو کو دخل نہیں میرا منصب

صرف سہوی امور کی درستی ہے۔
میں۔ بہت بہتر۔ جس امر میں آپ کا اختیار نہیں اس کے لئے میں آپ کو کیسے کہوں۔ مگر میری بیوی کہاں ہیں؟
ملک الموت۔ یہی تو غلطی ہوئی۔ ان کو لانا تھا آپ کو لے آئے۔ ان کو بہشت میں لیجانا تھا وہ اب وہاں جارہی ہیں۔
میں۔ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟
ملک الموت۔ جی نہیں۔
میں۔ کیوں۔
ملک الموت۔ ان کا یہ رتبہ نہیں۔
میں۔ تو آپ مجھے وہاں لیجائیں۔ میرے معزز میزبان خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ مجھے اس اپنی ملکہ سے مل لینے دو۔
نگران فرشتہ۔ پھر آپ نے وہی بے صبری کی بات کی۔
میں۔ (رو کر) معاف کیجئے۔ ﷲ معاف کیجئے مگر یہ کہاں کا دستور ہے کہ میاں مہمان اور بیوی الگ تھلگ۔ ختم مرسلین کی خاطر انہیں اپنا مہمان بنائیے۔
نگران فرشتہ۔ اے ضدی ذی روح۔ کاش کہ یہ تمہاری ضد نیک کاموں میں صرف ہوتی۔
میں۔ اس سے زیادہ کیا نیک کام ہو سکتا ہے کہ میں اپنی رفیق زندگی کو دلی پیار سے دیکھنا چاہوں؟
نگران فرشتہ۔ سچ کہتے ہو اور یہی جذبہ اُس ازلی نور کا جزو تمہیں ملا ہے جو تمہارے میں سے نیک اور صابر لوگوں کو فرشتوں سے بھی بالاتر رتبہ دیتا ہے۔
میں۔ جزاک اللہ۔

زہرہ۔ میری زہرہ۔ میرے دل۔ جان کی مالک زہرہ۔ میری ہر نیکی کی محرک زہرہ۔ ہر پاک خواہش کی موید زہرہ آئی۔ مسکرائی۔ اس کے پاؤں میں نے چومے۔ نئے انداز سے کہنے لگی۔ "پیارے صبر کروگے تو جلد ملیں گے"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں زہرہ چلی گئی۔
نگران فرشتہ۔ آیئے آپ کو دوزخ کی سیر کرا دوں۔
میں۔ جی حاضر۔
نگران فرشتہ۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کیوں ایسی ہولناک جگہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟
میں۔ جی صرف اس لئے چونکہ مجھے دنیا میں واپس جانا ہے میں دوست دشمن سب کو آگاہ کروں ان کے دلوں میں نور ایمان کے شعلے بھڑکاؤں۔ سچے دل سے ان کی خدمت کروں۔ منت سے محبت سے۔ آنسوؤں سے انہیں یقین دلاؤں کہ خدا کی رحمت بے پایاں ہے مگر اس کے رحم کو۔ انصاف کو۔ بخشش کو بہت نہ آزماؤ۔ بچو بچو۔

الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر

نگران فرشتہ۔ شوقِ خدمت بھی اسی نور کا ایک جزو ہے جو انسان کو باقی ذی الارواح سے ممتاز کرتا ہے۔ مگر تم چاہے کچھ کرو دنیا میں کوئی بھی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کریگا۔ سب تم پر ہسیں گے۔ اس بات پر یقین رکھو۔
میں۔ کوشش کرنا میرا فرض ہے اور میں ضرور کوشش کرونگا۔
نگران فرشتہ۔ شاباش۔ تمہارے ملک میں صبر کے معنے غلط مشہور ہیں۔ صبر کے صحیح معنے استقلال کے ہیں اور اسی معنے میں وہ آیۂ رحمت ہے۔

"ان اللہ مع الصابرین"

تکلیف کا برداشت کرنا صبر نہیں۔ باوجود ظاہری تکلیف کے نیک کام میں مستعدی سے لگے رہنا اور نہ ٹلنا اصل صبر ہے۔ خدا تمہیں اصلی صبر کی توفیق دے۔

ہم ابھی دوزخ کے صرف چند قطعات میں پھرے تھے کہ پھر بجلی کی چمک ہوئی۔ کڑکڑاہٹ سے ایک پنجہ ہماری جانب لپکا اور ہم دونوں کو اٹھا کر پھر اس نگران فرشتہ کے گھر میں چھوڑ گیا اور جاتے جاتے ایک فرمان نگران فرشتہ کو دے گیا۔ انہوں نے مجھے اس کا مطلب یوں بیان کیا۔
نگران فرشتہ۔ اے میرے عزیز مہمان۔ حکم ربی ہے کہ میں تجھے زیادہ مہمان نہ رکھوں۔ تو نے ایک بہشتن کے پاؤں چومے ہیں اس لئے دوزخ کی آگ تجھ پر حرام کی گئی ہے مگر گذشتہ گناہوں کی

پاداش میں یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جتنی تیری جسمانی زندگی دنیا میں باقی ہے وہی تیرے لئے دوزخ کا حکم رکھے۔ اب جاؤ۔ خدا حافظ۔"

میں اب زندہ ہوں۔ دوست رشتہ دار سب مبارک باد دیتے ہیں کہ میاں تم بچ گئے۔ انہیں کیا پتہ کہ یہ زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے۔ اور انہیں کیا پتہ کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے اب وہ پرچہ "ہوگی" "نہیں ہوگی" پھر نہیں ملیگا۔ انہیں کیا معلوم کہ بہشت کا پاس ماں کے بعد اگر کوئی دوسرا دینے والا ہے تو وہ نیک بیوی۔ انہیں تو صرف یہ خبر ہے کہ میں افسانہ نویسی کرتا ہوں۔ کاش کہ وہ سمجھیں۔

آخیر میں میں اتنا واضح کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ دوزخ کے مشاہدہ کا حال میں پھر بشرطِ صحت و زندگی لکھوں گا مگر جو چند قصص تھوڑے سال ہوئے مشہور ہوئے تھے وہ بہت حد تک بے بنیاد ہیں۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں مگر کسی ایرانی نے مشہد مقدس کے مظالم کے بعد کچھ مشہور کیا تھا جس کا لب لباب یہ ہے۔

"مسٹر گلیڈسٹون نے دوزخ میں جاکر باقاعدہ میونسپل کمیٹی قائم کی ہے۔ اس کمیٹی کے انتظام سے دوزخ میں جا بجا asbestos کے گھر بنائے جا رہے ہیں (Asbestos وہ مصالح ہے جس پر آگ کچھ اثر نہیں رکھتی۔ اب تو وہ ایک عام چیز ہے۔ یورپ کی ایجاد ہے جرمن قیصر نے بھی دوران جنگ میں ایک گھر یا کمرہ asbestos کا طیاروں کے آتش بار گولوں سے بچنے کے لئے بنوایا تھا) اندر ہی اندر سے سرنگ لگا کر بہشت سے پانی لایا گیا ہے۔ دروازوں پر یورپین فوج کا پہرہ ہے۔ بغیر پاس کے یورپین بھی اندر نہیں جا سکتا۔ ایشیائی تو پاس بے پاس سب محروم ہے۔ پانی کم ہو جانے سے بہشت کی کساد بازاری ہے بلکہ مسلمان لوگ وضو کے لئے بھی پانی سے تنگ ہیں۔ دوزخ بڑا بارونق ہوتا جاتا ہے۔ علمی مشاغل۔ فلسفیانہ مباحثے۔ ناچ رنگ سب کچھ جاری ہے۔ مسلمانوں کے لئے جو ایک بڑا طبقہ دوزخ میں محفوظ تھا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے گلیڈسٹون دوزخ میں الحاق ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی اب جگہ نہیں ملتی وغیرہ وغیرہ"

جہاں تک میں نے دوزخ کو دیکھا یہ سب قصّے مبالغہ آمیز ہیں۔ صرف ایک جگہ واقعی پہرہ تھا اور اس پر بڑے موٹے لفظوں میں لکھا تھا "Reserved for the Czar" یعنی زار روس کے لئے مخصوص ہے۔ دوزخ میں کم از کم مُسلمانوں کے املاک بدستور قائم ہیں۔ بلکہ ترقی پر ہیں۔ یہ محض افترا اور مسلمان قوم کی ہتک ہے کہ وہ دوزخ سے بھی بے دخل کئے جا رہے ہیں۔ پادشاہوں کا بہت بڑا ہجوم ہے۔ بیسیوں میں نے خود دیکھے جن کے آگے سونے چاندی کے سکوں کے ڈھیر پڑے ہیں اور وہ بڑی تندہی سے جیب پُر کر رہے ہیں۔ مگر دوزخ کے درزی ناقص ہیں۔ سب پادشاہوں کے جیب پھٹے ہُوئے تھے۔ وہ اشرفیاں ڈالتے جاتے تھے اور اشرفیاں گرتی جاتی تھیں۔

بہشت کی تباہی کا حال بھی غالباً قیاسی ہے۔ جب دوزخ والا قصّہ سچ نہیں تو یہ بھی ضرور بناوٹ ہوگی کہ اندرونی سرنگوں کے باعث بہشت کی نہروں میں پانی کم ہے۔ پیڑ مرجھا رہے ہیں۔ پھل کا نام نہیں۔ مٹی کے کوزے جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں۔ مسواکوں کے ڈھیر۔ ڈھیلوں کے انبار سے گلوگیر ہیں۔ نیلے تہ بند پھٹے پُرانے جا بجا لٹک رہے ہیں۔ کھجور کی گٹھلیاں۔ زمزمیوں کے ٹین جانمازوں میں لپٹے پڑے ہیں۔ امام بے تنخواہ۔ موذن فاقے سے۔ مسجد میں نہ دری نہ بوریا نہ چراغ میری رائے ناقص میں یہ سب قصّے ہیں۔ مگر میں خواہ مخواہ کسی ایرانی پر دروغ گوئی کی تہمت دھرنا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ جس طرح مجھے ملک الموت کی غلطی سے دوزخ کی سیر کا موقع ملا انہیں بہشت دوزخ دونوں کی سیر کا موقع ملا ہو۔ پبلک خود انصاف کر سکتی ہے۔ دروغ بر گردن راوی۔

بہت کوشش کی کہ اصلی مطلب پبلک پر بھی ظاہر نہ کروں مگر ایک طاقت ہے جو مجبور کر رہی ہے۔ مجھے ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ میرے دوستوں کو کیا پتہ کہ میری زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے وہ حکم یہ ہے۔

ہر صبح کو میرے ایک گذشتہ زندگی کے بےصبری میں ضائع کردہ دن کو میرے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس دن کو انسانی صورت دی جاتی ہے۔ صورت کس کی؟

بلعینہ میری

پھر مجھے ایک کند۔ ناکارہ۔ زنگ آلود چھُری دی جاتی ہے۔ پھر میں گھنٹوں اپنے آپ کو ذبح کرتا

ہوں۔ مرنے والے کے دم واپسیں کی نگاہیں کلیجہ چھلنی کئے ڈالتی ہیں۔ مگر میں کمبخت قسائی انسانی گلو پر نہیں اپنے گلو پر آرہ کشی کرتا جاتا ہوں۔

شام کو ہر روز میرے یہ گلو بریدہ مقتول مجھے اکٹھے ملتے ہیں۔ ایک کھچری سی ہوتی ہے۔ سب کے سب عجب دردناک طریقے سے میری طرف انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

یہ ہے ہمارا قاتل

ہائے وہ میری مجرمیت۔ اس پر عدالت کا سوال "کیوں؟" ستم۔ اے دوستو! اے پبلک! اے آنے والی بنی نوع انسان کی نسلو! بتاؤ اُس 'کیوں' کا کیا جواب دوں۔ تمہارے لئے یہ قصہ سہی۔ مگر میں تو روز صبح کو یہ ڈراما اور شام کو یہ مقدمہ دیکھتا ہوں میرے لئے تو قصہ نہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

زندہ دوزخی

شاعر کا فرض۔ وہ شاعر جو دنیا کو رفیع بنانے کی کوشش نہیں کرتا شاعر نہیں۔

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا" درست لیکن خام پیدا ہوتا ہے۔

قوم اور ادب۔ دنیا کی کوئی قوم ادب کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔

زبانیں اور جنگ۔ دنیا کی تمام زبانیں مصروفِ پیکار ہیں اور رہیں گی۔

اڈیٹر کو بہت وعدے نہیں کرنے چاہئیں۔

اڈیٹر سے بہت توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔

خالد۔

ٹیلیفون اور ہمزاد

ہمزاد کی نسبت سُنا کرتے تھے کہ جب وہ کسی کا تابعدار ہو جاتا ہے تو رات کو سونے نہیں دیتا ہر وقت باتیں کرتا رہتا ہے اس کا علاج یہ ہوتا تھا کہ اس کو درخت کے پتے شمار کرنے کا حکم دیدیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس مشکل کام میں مشغول رہے اور عامل ہمزاد کچھ دیر آرام کر سکے۔ مگر نئے زمانہ کے ہمزاد یعنے ٹیلیفون میں یہ بات نہیں ہے وہ کسی وقت بھی چین نہیں دیتا۔ اور اس کے چپ کرنے کی کوئی ترکیب ایجاد نہیں ہوئی۔

ہمزاد کالی صورت کا ایک چھوٹا سا بھتنا ہوتا ہے اور عامل کی پیٹھ کی طرف کھڑا ہو کر کان میں باتیں کرتا ہے۔ ٹیلیفون میں بھی وہی اوصاف ہیں۔ چھوٹا قد۔ کالی صورت کان میں گنگنانا۔ اور ہمزاد کی طرح کبھی صاف بولنا کبھی باتوں کو چبا جانا۔

ہمزاد ہندوستانی بھوت ہے۔ ٹیلیفون ولایتی بھوت ہے۔ ہمزاد تابع کرنے میں صرف وقت خرچ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں وقت بہت ارزاں چیز ہے۔ ٹیلیفون روپے کے زور سے تابع ہوتا ہے کہ ولایت میں روپیہ بہت ضروری چیز ہے۔ ہمزاد اپنے عامل کو لوگوں کی نظروں میں مرغوب بنا دیتا ہے کیونکہ صدہا آدمی عامل ہمزاد کے پاس آتے ہیں اور اس سے خبریں دریافت کرتے ہیں پوشیدہ چیزیں منگاتے ہیں۔ وہ عامل سے ڈرتے ہیں۔ اور اس کی عزت بھی کرتے ہیں اور بعض لوگ نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔ ٹیلیفون بھی اپنے مالک کی ضرورت کو لوگوں کی نظروں میں بڑھا دیتا ہے۔ جن کے ہاں ٹیلیفون نہ ہو وہ مالک ٹیلیفون کے پاس عاجزانہ خوشامدیں کرتے ہوئے آتے ہیں اور ٹیلیفون میں دو باتیں کر لینے کی اجازت مانگتے ہیں اور مالک صاحب انداز غرور و تمکنت سے اجازت کی گردن ہلاتے ہیں۔

ہمزاد و ٹیلیفون میں ہندوستان و یورپ کی مکمل تہذیب موجود ہے ہمزاد صرف اپنے عامل کو نظر آتا ہے۔ اپنے عامل سے بات کرتا ہے اور اس کے سوا کسی غیر سے مخاطب نہیں ہوتا اور ٹیلیفون یورپین عورتوں کی طرح ہر شخص سے بات کرنے میں آزاد ہے اور پوشیدہ رہنے کی عادت ان میں نہیں ہے۔ ہمزاد کبھی نقدی نہیں مانگتا۔ ٹیلیفون سال کے سال اپنا ٹیکس لینے آن کھڑا ہوتا ہے۔

ہمزاد میں ایسا کوئی پرزہ نہیں ہوتا جسکے خراب ہونے سے سارا ہمزاد بیکار ہوجائے ٹیلیفون میں یورپ کی یہ خصوصیت پوری طرح موجود ہے۔ یورپ کی ہر چیز کا قاعدہ ہے کہ اسکے وجود میں دو چار۔ دس پانچ۔ سو پچاس۔ ایسے ٹکڑے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں کا ایک بھی بگڑ جائے تو باقی کے سب اچھے بچھے پرزے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیکار بیٹھ جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ جناب جب تک ہمارے بھائی کو منانے کے لئے کچھ خرچ نہ کروگے ہم سب کام نہ کرینگے۔ کہو بھائی تمہیں پرائی بات سے کیا سروکار تم اپنا کام کئے جاؤ تو جواب ملتا ہے کہ ہم میں کا ہر پرزہ ایک خاص کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اور ہمارے ملک والوں نے جان بوجھ کر یہ حکمت رکھی ہے کہ خریدار ہر کارخانہ کا محتاج رہے۔ یہ نہ ہو تو سب لوگوں کا کام مساوی حیثیت میں نہ چل سکے۔

ہمزاد کی تکلیف شخصی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے عامل کو ستاتا ہے اور جگاتا ہے۔ ٹیلیفون جمہوری ملک کا ہے اس کی تکلیف بھی جمہوری ہے۔ تمام گھر والوں کو اسکی ذات سے اذیت ہے۔ گھڑی گھڑی گھنٹیاں بجاتا ہے جاکر پوچھو کیا کہتے ہو۔ جواب دیتا ہے آپ کہاں سے بولتے ہیں غصہ آتا ہے کہ کیا بے تمیزی کا سوال ہے سب لوگ مُنہ سے بولا کرتے ہیں۔ پھر یہ پوچھنے کی کیا بات ہے۔ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ آپ کون صاحب ہیں اور کس مقام پر ہیں؟

یہی ایک تکلیف نہیں ہے ٹیلیفون میں ہزار قسم کی تکلیفیں ہیں۔ اول تو نمبر ملانے والے ستاتے ہیں کبھی جلدی نمبر ملا دیتے ہیں کبھی اتنی دیر لگاتے ہیں کہ کن بات (رسیور) کو کان سے لگائے جمائیاں لیتے رہو اور ہو ہو پکارے جاؤ وہاں سے نمبر بلیز کا جواب نہیں آتا۔ اور آتا ہے تو ایسا جیسا کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہے اور غنودگی میں بولتا ہے۔ کبھی فوراً کہدیا جاتا ہے انگیج (مشغول) ہے۔ دوسری جگہ (رکا ہوا) ہے۔ حالانکہ اس میں صحت نہیں ہوتی۔ اور نمبر ملانے کی محنت سے بچنے کے لئے کہدیا جاتا ہے۔ کبھی ایسے لوگ ٹیلیفون میں بات کرنی چاہتے ہیں جنکو کبھی اس ولایتی بھوت کے ذریعہ بات کرنیکا اتفاق نہیں ہوا۔ انکی ادھوری باتیں اور گھبراہٹ انسان کو تکلیف دیتی ہے۔ کبھی شریر لوگ اپنے دل کے بخار ٹیلیفون کے ذریعہ نکالتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے بکتے ہیں اور کوئی گرفت انکی نہیں ہوسکتی کیونکہ ولایتی بھوت کے عجائبات میں ایک یہ بات بھی ہے کہ اسکو ناجائز استعمال کرنے کی آزادی بھی ہوتی ہے۔

الغرض ہمزاد اور ٹیلیفون میں وہی فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے۔ جو کالے اور گورے میں ہے جو جاہل اور عالم میں ہے۔ اور ان دونوں کے حاصل کرنے میں تکلیف اور راحت برابر کی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ مگر ٹیلیفون میں راحت کم ہے اور تکلیف زیادہ ہے۔ جنکو یہ نعمت میسر نہیں ہے

وہ شاید عمل ہمزاد کے مشتاقوں کی طرح اس بات کو نہ مانیں مگر میں نے تو اس نعمت یورپ کو اچھی طرح آزما کر لکھا ہے کہ میرا ہمزاد اس ٹیلیفون کی بلا سے لاکھ درجہ اچھا تھا۔ اگرچہ تھا تو وہ بھی بلائے بے درماں مگر نہ ایسا کہ نہ رات چین ہے نہ دن چین ہے۔ جب ذرا خیال جما کر کوئی کام شروع کیا اور ٹیلیفون نے گھنٹی بجا کر اس میں رخنہ ڈالا۔

ہندوستان میں آکر ولایت کی ہر چیز ایک فیشن اور آزاد بندہ بن جاتی ہے ٹیلیفون بہت کام کی چیز تھی۔ گھر بیٹھے میلوں اور کوسوں کی بات کان میں آجاتی تھی۔ مگر ہندوستان میں کاروبار کی آسانی کے لئے اسکو استعمال نہیں کیا جاتا یہاں تو یہ کام رہ گیا ہے۔ ٹن ٹن ٹن۔ کون صاحب ہیں؟ میں ہوں صاحب داد خاں۔ کیا ارشاد ہے؟ جی کچھ نہیں بس یہ معلوم کرنا تھا کہ آپ کے ہاں میری آواز جاتی ہے یا نہیں۔ آداب عرض ہے۔ جاتا ہوں۔

حسن نظامی

متوالے

او آہن پوش طعن نیوش متوالو! تم جہاں جا رہے ہو وہاں رکھا کیا ہے؟ تمہیں خبر نہیں تم معذور ہو!

با خبر اُستاد کے ضدی سبق خوانو! جب معنے تمہیں نہیں آتے تو دو سطر سبق نوک زبان کرنے سے کیا وجد ہوگا۔ کاش کاش کہ مطلب بھی سمجھو اور سمجھاؤ!

زندان وہ ہے جہاں سے تم جاتے ہو۔ جہاں رسم کہتی ہے کہ بھائی کو بھائی نہ چھوئے جہاں تن آسانی سکھلاتی ہے کہ یہ سہل ہے کہ غیر کا بار خویشوں میں حصہ رسدی تقسیم ہو مگر یہ مشکل کہ غیر کو لیاقت کے جادو سے ایسا تسخیر کرو کہ تم سے بارکشی کرانیکا خیال تک بھلادے۔

جسے تم بندی خانہ سمجھے ہو وہ مکتب ہے اور درس صرف یہ کہ پرائے کو اپنا بناؤ یہانتک کہ نہ کوئی زور دست رہے نہ زیر دست۔ اتنا سمجھ جاؤ تو کہیں جانیکی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھا نہ سکو تو بھولے وفا شعار دلوں کی آبادیوں میں جفا کے ہل چل جائینگے۔ رکو سنبھلو او متوالو! یہ مستانہ شیوہ کب تک؟ بس یہی ناکہ چند قدم لڑکھڑاؤ گے اور پھر ہانکے جاؤ گے!!

اس صنم خانہ کے پرستار اب شیوۂ مردانگی کے طلبگار ہیں۔ وہ مردانگی جس پر حریف عش عش کرے۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے نمونہ اور ہمارے لئے آئین ہو۔ جو سیکھے سکھائے سنے سنائے نہیں بلکہ دل سے پیدا ہو اور نگاہ سے یوں ٹپکے کہ زبان و بازو کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔

او متوالو! جہاں چلن کی ضرورت ہو وہاں چال کو کوئی کیا کرے۔

عبدالعزیز

لغات الجاہلین

ڈاکٹر۔ ہمدرد ہو تو مسیحائے زمان مردہ کو زندہ کرنے والا۔ ورنہ عام طور پر بے درد انسان زندہ کو مردہ کرنے والا۔ قبرستان کی آبادی میں ہر سال معتد بہ اضافہ کرنے پر مصر۔ اپنی فیس پوری وصول کرنے پر بضد گو اس کو یقین ہو کہ اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی مریض کا دم بھی ساتھ ہی نکل جاویگا عمل جراحی سے کسی کو لنگڑا کسی کو لولا کسی کو لنجا کر دینے والا۔ جس کے قلم کے ایک کش سے ضرب خفیف شدید میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قتل عمد اتفاقیہ موت یا تلی پھٹ جانے یا دل کی حرکت بند ہو جانے کے باعث موت میں بدل جاتا ہے جو کسی مرض کا نام سنتے ہی نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ خواہ مریض کا مزاج سوداوی ہو یا بلغمی یا صفراوی یا کیا۔ جو معقول فیس ملنے پر ملازموں کو سالہا سال کی بیماری کی رخصت دلا دیتا ہے۔ مگر کم فیس ملنے پر حقیقی بیمار کو ادائیگی فرایض کے قابل فرما دیتا ہے۔ وہ مستند شخص جو کسی ہسپتال میں چھ ماہ تک بیمار رہا ہو۔ یا تین ماہ تک کمپوڈری کا کام سیکھتا رہا ہو۔ وہ شخص جو انگریزی ادویات کے اردو میں لکھے ہوئے ناموں کو خاص لب ولہجہ کے ساتھ حفظ کرتا ہو۔

دیسی حکیم وہ شخص جو نیلوفر بنفشہ صندل بزوری دینار وغیرہ کے شربت ایک ہی بوتل سے بیچتا ہے گو وہ جانتا ہے کہ اس میں سوائے خالص چینی کے اور کوئی چیز نہیں۔

ص۔ د۔ ق

شاعر۔ کسی کام کے بغیر مصروف رہنے کے فن میں مشاق۔ بیکار مباش کچھ کیا کر، کا مصداق۔ شہر کے اندیشے میں دبلا ہونیوالا قاضی۔ حال فراموش، سوگوار ماضی۔ بغیر فیس لئے لیلیٰ و مجنوں کا وکیل۔ دل اور دماغ کی بے تعلقی کی دلیل۔ خیال کے جال میں جذبات کو پکڑنے والا شکاری۔ اظہار سے معمور، احساس سے عاری۔ کل کائنات کا خواہ مخواہ رازدار۔ کسی بیماری کے بغیر بیمار الغرض ایک خدائی فوجدار۔

آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے

(ا۔ ش)

محفلِ ادب

عثمانیہ یونیورسٹی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق فرماتے ہیں:۔
دُنیائے علم و تعلیم کے ہر فرد نے شاید عثمانیہ یونیورسٹی کا نام سُنا ہوگا۔ لیکن اکثر اشخاص کے لئے یہ صرف ایک لفظ ہی ہے۔ حالانکہ وہ ہندوستان کی یونیورسٹی تعلیم میں ایک انقلاب پیدا کر رہی ہے اس کا نام ہمارے سامنے بغداد۔ قرطبہ۔ یا قاہرہ کے خوابہائے پریشاں کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کی ایک ریاست کا عملی مرکز ہے یہ نوزائیدہ یونیورسٹی ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام کی مربیانہ توجہ سے عالم وجود میں آئی ہے اور اس روشن خیال والی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شاید نہایت ہی انسب ہُوا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست نے اس کام کی طرف سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے جو ہندوستان میں یونیورسٹی تعلیم کے انقلاب عظیم کی خبر دیتا ہے۔ اکثر ہم یہ دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ کہ ہندوستانی ریاستیں جو عموماً برطانوی ہند کے مقابل میں بہت ہی پسماندہ اور جامد سمجھی جاتی ہیں۔ اور علانیہ "زیر حمایت" کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ تعلیم و معاشرت کے میدان اصلاح میں سب سے پہلے بہادرانہ قدم رکھتی ہیں۔

تعلیم یافتہ اور سُست ریاست حیدر آباد نے جو وفاداری، شان و شوکت اور عزت و عظمت کی قدیم روایات پر اب تک قایم ہے۔ ایک نہایت ہی عظیم و اہم تجربہ کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ ٹھیک اس وقت جبکہ تمام ہندوستان اس موضوع پر کہ تعلیم کے مختلف مدارج میں کونسی زبان رکھی جائے سرگرم مباحثہ ہے۔ اس حوصلہ مند ریاست نے بُرا یا بھلا جیسا بھی ہو۔ ایک فیصلہ کن قدم آگے بڑھا دیا ہے۔ اور اس بات پر فخر کر سکتی ہے۔ کہ یہ عزت اسی کے حصّہ میں آئی ہے۔ کہ دیسی زبانوں کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کی وہ اولین رہنما ہے۔ یہ اس جامعہ کی خصوصیت ہے۔ صرف زمانہ اس کے نتیجہ کا فیصلہ کریگا +

(معارف)

کیا مانی مصوّر تھا؟ ابو ریحان بیرونی تحقیق الہند میں خود مانی کی تصنیف شاہ برقان کے حوالہ

سے لکھتا ہے۔کہ"وہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بمقام ہمدان پیدا ہوُا۔ اس کا باپ، جس کا نام پاتک تھا (عرب مورخین جسے فتق کہتے ہیں) ہمدان کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مانی کی ماں کا نام مارمریم یا اُتاجنم تھا، جو ایران کے قدیم شاہی خاندان اشغانی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرق میں زردشتی مذہب اور مغرب میں مسیحی مذہب اپنے عروج پر تھے۔ اس کا باپ چونکہ خود بھی بعد کو مسیح مغتلہ (Baptist) طبقہ میں شامل ہو گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے۔ کہ مانی کی ابتدائی تعلیم، جو اس کے باپ ہی کے پاس ہوُئی۔ مسیحی معتقدات کے زیر اثر ہوُئی ہوگی۔ لیکن خود مانی کا بیان یہ ہے۔ کہ میں ابھی جنین ہی میں تھا کہ توم فرشتہ میری ماں کو حالتِ حمل میں نظر آتا اور ظاہر کرتا۔ کہ تیرے بطن سے ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی ہوُئی تو مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہونے لگی اور چوبیس سال کی عمر تھی کہ میں نے تبلیغ حق و صداقت شروع کردی،،

اس وقت شاپور ایران کا حکمران تھا۔ اس لئے مانی نے سب سے پہلے اسی کو مخاطب بنانا مناسب سمجھا۔ شاپور کا بھائی پیروز اس سے قبل اس کا معتقد ہو گیا تھا، اس لئے مانی اسی کے ذریعہ سے شاپور کے دربار تک پہنچا اور وہاں اپنے تئیں پیغمبر ظاہر کرکے اپنی تعلیمات پیش کیں۔

یعقوبی کا بیان ہے۔ کہ جب مانی ابن حمار شاہ پور کے دربار میں آیا۔ تو اس نے زردشتی مذہب کی برائیاں بیان کرکے کہا،" کہ نظام کائنات دو قوتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایک کا قبضہ تاریکی پر ہے۔ جس سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری قوت روشنی کی مالک ہے جس سے تمام نیکیاں رُونما ہوُئی ہیں،، شاپور نے اس کے اصول تسلیم کرلئے اور اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ مانوی مذہب اختیار کرلیں اب چونکہ فرمانروائے وقت نے اس کا مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت اہتمام سے اپنے معتقدات کی تبلیغ شروع کی اور اسی سلسلہ میں اس نے سات (۷) کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں سے چھ شامی زبان میں تھیں اور ایک شاپترماں، قدیم پہلوی زبان میں۔ (نگار)

قصہ نویسی۔ شاید یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کہ اپنی پسند اور نفس کی رہنمائی کا ہمیشہ اتباع کیا جاتا ہے اس لئے بعض افعال کی کثرت ضرب المثل اور داخل عادت سمجھی جاتی ہے میری نظر سے جہاں تک تذکرے گزرے اُن سب کا خلاصۂ نقائص بھی طوالت کا سبب ہو گا۔ مگر مشتے نمونہ از خروارے

کچھ امور قابل ذکر ضرور ہیں۔ بالعموم تذکرہ نویسوں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ جس شخص پر زیادہ توجہ ہوئی اس کی تعریف کے انبار لگا دیئے۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں۔ کہ اس سے اُنکو فی نفسہ کوئی وابستگی ہو۔ بلکہ فطرتاً ان کا وقار اُن کے دل پر مرتکز ہے۔ یا کلام زیادہ پسندیدہ ہے۔ حالانکہ اہل تذکرہ کو لازم ہے کہ شاعر کا اصل حال بغیر کسی رو رعایت کے تحریر کریں۔ عداوت کا اظہار تذکرہ نویسی میں کسی طرح زیبا نہیں اول سے آخر تک نیک نیتی ثابت ہونا چاہیئے۔ انصاف کا ہر جگہ لحاظ ازبس ضروری ہے۔ سب سے بڑا سقم انتخاب کلام کی وجہ سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں یا تو یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر انتخاب اچھا ہُوا تو اُمیدوں کا خون ہو گیا۔ اس لئے زیادہ مناسب صورت یہ ہے۔ کہ بقدر گنجایش پوری پوری غزلیں نقل کر دی جائیں۔ تاکہ ناظرین شاعر کی استعداد کا خود اندازہ کر لیں۔ اور فن شعر کی دستگاہ اور رتبہ سے کماحقہ ماہر ہو جائیں۔ مگر افسوس ہے۔ کہ تذکرہ نویس ایسا نہیں کرتے۔ یا تو شاعر کو فلک الافلاک پر پہنچا دیتے ہیں۔ یا قعر مذلت میں گرا دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ بے رحمی وہ فرو گذاشت ہے۔ جبکہ بعض قابل ذکر شعرا سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے۔ (اعجاز)

آواز قبر۔

گویا ہے زبانِ بے زبانی — عبرت یہ دکھا رہی ہے اعجاز
سُن لے اے راہ گیر سُن لے — اک قبر سے آ رہی ہے آواز
اس گوشۂ تنگ کی رہے فکر — آراستہ جب ہو محفلِ ناز
یہ عالمِ بیکسی نہ بھولے — جب جمع ہوں دوستانِ ہمراز
یہ کنج خموش بھی رہے یاد — جب آئے صدائے نغمۂ ساز
یہ نقشِ فنا مٹے نہ دل سے — آغوش میں جب ہو یارِ دمساز
یہ خوابِ عدم نہ ہو فراموش — جب دورِ شراب کا ہو آغاز

(تاجور) (دین و دنیا)

مختصر قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ پڑھنے والوں کو سبق حاصل ہو اور کوئی نصیحت ملے۔ بلکہ اُن کا مدعا محض دلچسپی اور دل بہلاوا ہے۔ کامیاب قصہ صرف وہ ہے۔ جسکو پڑھ کر ایسا معلوم ہو۔

گویا حقیقت کی تصویر الفاظ میں کھینچ دی گئی ہے۔ قصہ نویس کو اُپدیشک نہیں بلکہ مصور ہونا چاہیئے۔ جو جیسا نظارہ لیتا ہے۔ اُسے ایمانداری سے ادا کر دیتا ہے۔ بابو رابیندر ناتھ ٹیگور سے دریافت کیا گیا۔ آپ مختصر قصے کیوں لکھتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا۔ کیونکہ میرے دل میں خیالات اُٹھتے ہیں۔ اور میں اُنہیں دُنیا کے سامنے پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنہیں نصیحتوں اور اُپدیشوں کی ضرورت ہو۔ اُن کے لئے قصوں کی کتابیں پڑھنا پانی بلونے کے مترادف ہے ـــــ قصہ نویسی آرٹ ہے اسے آرٹ کی نگاہ سے ہی دیکھنا چاہیئے ٭

(دُردپم۔ بنگالی)

لٹریچر میں ناٹک کو درجہ امتیاز حاصل ہے۔ اس سے کسی قوم و ملک کی تہذیب کا سراغ مل سکتا ہے ناٹک قوم کی زندگی کی تصویر ہے۔ ناٹک قوم کے اندرونی جذبات کا کھلا ہُوا بیان ہے، اُس کے ماضی کی پُر شکوہ داستان ہے۔ مگر ناٹک تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ اور ناٹک کے مابین ایک امتیازی دیوار حایل ہے۔ تاریخ کسی قوم کی مردہ تصویر ہے۔ ناٹک اُس کی زندہ کہانی ہے۔ تاریخ میں پُرانے واقعات کو عہد ماضی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ناٹک میں اُنہی واقعات کو زندہ کر کے دورِ حاضرہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ "تھا، تھی اور تھے" کا مجموعہ ہے۔ ناٹک "ہے اور ہیں" کا فسانہ ہے۔ تاریخ پڑھ کر طبیعت فسردہ ہو جاتی ہے، ناٹک دیکھ کر رگوں میں خون اُبلنے لگ جاتا ہے۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، تا وقتیکہ وہ ناٹک کی ماہیت اور اہمیت کو کامل طور پر محسوس نہ کرلے ٭

(سدرشن) (سُودیھ۔ ہندی)

حاجب ابن زرارہ (ایک عرب نژاد) کسریٰ سے ملنے کی آرزو لے کر اس کے شاہی محل تک پہنچا اور دربان کے دریافت کرنے پر کہا کہ میں ملک عرب کا ایک باشندہ ہوں۔ کسریٰ نے اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ "تم کون ہو؟" اس نے جواب دیا کہ "سید العرب" کسریٰ نے کہا تم نے دربان سے تو کہا ہے کہ میں اہل عرب میں سے ایک عام آدمی ہوں حاجب ابن زرارہ نے جواب دیا کہ ہاں میں کسریٰ سے ملنے سے پہلے عرب کا ایک عام باشندہ تھا لیکن کسریٰ کے شرف حضوری حاصل کرنے کے بعد اب میں "سید العرب" ہوں کسریٰ نے اس جواب پر اظہارِ تحسین کیا اور حکم دیا کہ اس شخص کا مُنہ موتیوں سے بھرا جائے۔

(تاجور) الہلال (مصر)

کچھ عرصہ گذرا، سربلند پہاڑ کے ایک تاریک غار میں ایک آدمی رہتا تھا وہ جوگی تھا
دُنیا اُس کے لئے موجب کشش نہ تھی۔ اُس کی راتیں حُسن و عشق کے خیالوں اور اُس کے خواب زندگی کی مسرتوں سے محروم تھے۔
اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادت کے لئے وقف ہوچکا تھا وہ جوگی تھا

ایک دن اُس پہاڑ پر ایک عورت چڑھی۔
اُس کی آنکھیں مستِ شباب نہ تھیں، اُسکے بال حسین نہ تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر خوبصورتی نہیں کھیلتی تھی۔ مگر عورت تھی وہ پہاڑ پر چڑھی

اب وہاں ایک مرد رہتا ہے۔
اُس کے ساتھ ایک عورت رہتی ہے۔
وہاں جوگی نہیں رہا۔ (سمارٹ سٹ)
نامستول

عورت کا دل بچّے کی جیب ہے۔ جس میں وہ جو کچھ ملتا ہے پرشوق ہاتھوں سے ڈال لیتا ہے ــــ ٹوٹا ہُوا تاگا، مرجھایا ہُوا پھول کھوٹا سکّا، پتھر کا ٹکڑا۔ چاقو کا دستہ۔ یہ سب اشیا ناکارہ ہیں۔ انکو سمجھدار دُنیا نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور حقارت کی ٹھوکر لگاکر راستے سے پرے ہٹا دیتی ہے مگر چھوٹے بچّے کے لئے یہ عجائبات دُنیا سے بھی قیمتی ہیں۔ وہ اُن پر اپنی جان عزیز چھڑکتا ہے۔
عورت کا دل بھی بچّے کی جیب ہے جس میں اُسے جو کچھ ملتا ہے۔ پُرشوق ہاتھوں سے ڈال لیتی ہے۔
نفرت کے دو لفظ، محبت کا ایک کلمہ، لاپروائی کا قہقہہ، شوق بھری آواہ نگاہیں، جعلی سرد آہیں، یہ سب اشیاء ناکارہ ہیں۔ سمجھدار (مردوں کی) دنیا ان کو دیکھ کر چونک اُٹھتی ہے۔ مگر عورت کے لئے یہ بیش قیمت خزانہ ہے۔ وہ اُسے مردوں سے چھپا کر رکھتی ہے۔ (سدرشن) نیو میگزین

بربریت کیا ہے؟ بربریت انفرادیت ہے اتہذیب محض ضمیر کی اشتراکیت ہے۔

سلطنت فقط اُس عام عارضہ کی اک دوسری شکل ہے جو انانیت کہلاتا ہے۔ اور سیاسیات میں اس کا عمل ویسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے جیسا کہ فردِ واحد میں + غاروں میں رہنے والا وحشی آدمی بھی اک ضمیر رکھتا تھا بعینہ جیسے ہم رکھتے ہیں۔ زیادہ فرق یہ تھا کہ اُس کا ضمیر اُسی سے واسطہ رکھتا تھا + حفاظتِ نفس قدرت کا پہلا قانون ہے اور انسان اُس زمانے میں اسی قانون کے احاطۂ کے اندر محصور تھا۔ اُسکے اپنے حقوق و جذبات اُس کی اپنی خواہشات و خیالات یہی چیزیں اُسے بھلی معلوم ہوتی تھیں اور انہیں کی وہ نگہداشت کرتا تھا +

جب اُس نے ایک رفیقِ زندگی بنایا اور اُسکے بال بچے بڑھے تو اُسکا ضمیر زیادہ وسیع ہُوا اور اُسکے نئے تعلقات اُسکی شخصیت کا جُز بنگئے۔ اُس نے اپنی زوجہ اور بال بچوں کی محافظت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی کہ اپنی +

بعد کو رفتہ رفتہ اُسکے بچوں نے آپس میں شادیاں کیں اور وہ ایک قبیلہ کا جُز بن گیا۔ وہ اور زیادہ وسیع ہوگیا اُس کا ضمیر قبیلہ کا ضمیر ہوگیا +

وسعت کا عمل جاری رہا۔ قبیلہ ایک ریاست یا اک چھوٹی سی دولت بن گیا +

پھر یہ چھوٹے چھوٹے گروہ متحد ہو کر ایک بڑا گروہ بن گئے جس کا نام قوم رکھا گیا +

اُس کا انفرادی ضمیر اب بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا جسے حُبِ قومی کہتے ہیں +

لیکن قوم و ملک کی محبت تہذیب کی انتہا نہیں یہ تو ترقی کی شاہ راہ پر فقط اک عارضی قیامگاہ ہے اور صحیح منتہائے کمال انسانیت ہے انسان کا ضمیر مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ قومیت سے اک زیادہ وسیع جذبے سے متاثر نہ ہو۔ کیونکہ ضمیر کی حقیقی اور دائمی بنیاد نوعِ انسان پر ہے +

جس قدر ہم مُلک مُلک کے تمام لوگوں کے لئے احساسِ خدمت محسوس کریں ہم مہذب ہیں اور جس قدر ہم میں یہ قوتِ بصیرت کم ہو ہم ناشائستہ و غیر متمدن ہیں +

سینڈرن اپنی تصنیف "سُخنِ جنبش" میں لکھتا ہے کہ ربِ خالق نے انسانوں کو تعلیم دی کہ قبیلے کے دائرے میں چوری کرنا گناہ ہے +

اسی بنا پر اُس نوع کی قومیت جو یہ سکھاتی ہے کہ ہمیں صرف اپنے ہم مُلکوں سے وفاداری اور انصاف برتنا چاہیئے۔ نیم وحشی ہے!

وہ عظیم الشان منتہائے کمال جسکی طرف دُنیا سرگرمِ سفر ہے۔ جسکی طرف واقعات ہمیں کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں اور جسکی طرف دُنیا کے بہترین خیالات یکسوئی کے ساتھ جُھکتے جاتے ہیں نوعِ انسان کا اتحاد ہے اور اُن تمام انسانی عدل و حق رسانی کے اوصاف کا دوسری قوموں کے ساتھ روا رکھنا جن کا ہم اپنے ہم قوموں کے ساتھ برتنا لازم جانتے ہیں!

(کرنٹ اوپی نین) (ب)

حصۂ نظم

کلامِ اکبر

آپ سُن لیجئے معنی ہیں کچھ اس بات کے بھی — گردشِ چرخ میں موسم ہیں خیالات کے بھی
فلسفا بھی کبھی موسم میں بدل جاتا ہے — اور ہی سانچے میں دلِ خلق کا ڈھل جاتا ہے
لاکھ سمجھاتا ہوں اسکو میز پر آ جائے پی — یہ عروسِ ہند اب تک کہہ رہی ہے ہائے پی

رباعیاتِ گرامی

اے روح بجسمِ زار نالی تا چند — در بندِ قفس شکستہ بالی تا چند
پر برزن و بر فرازِ سدرہ بنشیں — در مرکزِ فتنہ خاکمالی تا چند

برخیز کہ عارفان بخود سیر کنند — در پردہ نظر بکعبہ و دیر کنند
خود را دیدند غیر از خود رفتند — خود غیرِ خود ند قطع از غیر کنند

گویائے رباعیم بخود غیرم من — دانائے رموزم آسمان سیرم من
از بندۂ خیر شر نیاید بوجود — از حلقہ بگوشانِ ابوالخیرم من

آصف الدولہ کا امام باڑہ

(لکھنو)

آصف الدولۂ مرحوم کی تعمیرِ کہن — خاک پر عرش کو دیتی ہے بلندی کا جواب
دیکھ سیاح! اسے رات کے سناٹے میں — مُنہ سے اپنے مہ کامل نے جب اُلٹی ہو نقاب

در و دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سبک
یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مَس اس کو نہیں
یک بہ یک دیدۂ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے
بے خودی کہتی ہے آیا یہ زمیں پر کیونکر

سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
ہے سنبھالے ہُوئے دامن میں ہوائے شاداب
ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اُتر آیا ہے سحاب
کسی اُستادِ مصوّر کا ہے یہ جلوۂ خواب

اک عجب منظرِ دلگیر نظر آتا ہے
دور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

شوکت و شانِ عمارت کی خبر دیتا ہے
وہ سپیدی سحرِ نور کی ہلکی ہلکی
ایسے عالم میں وہ کہرے سے اُبھرنا اس کا
ہوتے ہیں گنبد و مینار فضا میں ظاہر
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوانِ بلند
پارۂ چوب کے احسان کی ضرورت نہ رہی
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمارِ فرنگ
بچ گیا خاک کے پردہ پہ یہ مٹی کا طِلسم
اس کے سایۂ میں گرا تاجِ حکومت سر سے
مِل گئے خاک میں سب اس کے بنانے والے
کیا سرِ شام اُداسی کا سماں رہتا ہے
دھوپ اُترتی ہُوئی آنکھوں کو یہ دکھلاتی ہے
جس کے فیضانِ حکومت کا کرشمہ ہے یہ
اُس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اِس کی
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں

پردۂ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز
بڑھ کے ہوتی ہیں زیارت سے نگاہیں ممتاز
جس کی صنعت کا ہے دنیا سے نرالا انداز
خاک اور خشت نے مِل کر یہ دکھایا اعجاز
ہے یہ تہذیبِ اودھ کے لئے سرمایۂ ناز
ورنہ دُنیا کی ہوا اس کے لئے تھی ناساز
اس نے دیکھا یہ زمانہ کا نشیب اور فراز
کچھ شجر ہائے کہن اب ہیں پُرانے دمساز
در و دیوار سے کر جاتی ہے رونق پرواز
دلِ مجروح کا ہر خشت میں ہے سوز و گداز
اس کے دامن میں ہے سویا ہُوا وہ خلق نواز
اُس کے اخلاق کی وسعت کا ہے اِس میں انداز
چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز

بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہ است
سجدہ گاہِ ملک و روضۂ شاہنشاہ است

چکبست لکھنوی

قطعہ

کسی نے آکے جنابِ جنید سے یہ کہا　　کہ آج کل ہے زمانے کا کچھ عجیب حساب

جو میل جول کی پوچھو تو ملنے والے لاکھ　　جو دل ٹٹول کے دیکھو تو دوستی نایاب

کل آکے کی تھیں محبت کی سینکڑوں باتیں　　کچھ آج یاد نہیں جیسے پچھلی رات کا خواب

کہا جنید نے مطلب کے ساتھ ملنا کیا　　بناؤ اور بگاڑ اُس کا ہو یہ شکلِ حباب

وفا جو اور سے چاہی تو خود غرض ٹھیرے　　وفا شعار ہوئے خود تو خود غرض احباب

احمد علی۔ شوق۔ قدوائی۔

سفرِ عدم کی اطلاع

یہ نظم جناب زاہدہ خاتون صاحبہ شروانیہ (ز۔خ۔ش) عرف "سخن گو خاتون" نے خواجہ بانو کے پاس بھیجی تھی اور غالباً ابھی کہیں چھپی نہیں ہے۔ اس وقت جبکہ ملک میں خاتون محترمہ کی وفات سے جگہ جگہ ماتم ہو رہا ہے اور تعلیمیافتہ گھرانوں میں اس موت کو قومی حادثہ خیال کیا جاتا ہے اس نظم کا شایع ہونا کئی اعتبار سے اچھا ہے۔ ایک تو مرحومہ کی شاعرانہ قابلیت مکرر روشنی میں نظر آئیگی۔ دوسرے انکی وہ فلسفیانہ وصوفیانہ ذہانت معلوم ہوگی جو خدا نے انکو عطا فرمائی تھی۔ تیسری بات جو سب سے زیادہ ہے وہ مرحومہ کی قوتِ کشف ہے۔ اس نظم میں انہوں نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ ملنا ہے تو مل لو ورنہ اب میں عدم کے سفر کو جانے والی ہوں۔

حسن نظامی

لذتِ دید کا چسکا ہے تو آ دیکھ مجھے　　صاحبِ دیدۂ بینا ہے تو آ دیکھ مجھے

جو نہ دیکھا تھا کبھی تجھ کو دکھائی دیگا　　ساری دُنیا کو بھی دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے

ترجمانِ دلِ پُر شوق ہے صورت کہ نہیں؟　　تو قیافہ کی شناسا ہے تو آ دیکھ مجھے

مٹ گیا فرقِ من و تو جو مٹی میں تجھ پر　　آئینہ گر نہیں دیکھا ہے تو آ دیکھ مجھے

میری صورت ہے تماشہ گہِ یاس و امید　　تجھ کو گر شوقِ تماشا ہے تو آ دیکھ مجھے

دیدنی ہے مرے پہلو کا پری خانہ بھی　　سیرِ باطن کی تمنا ہے تو آ دیکھ مجھے

اُس کی قدرت کا اک ادنےٰ سا کرشمہ ہوں میں　　الفتِ ہستیٔ اعلےٰ ہے تو آ دیکھ مجھے

سب مری بات پہ کہتے ہیں کہ مختل ہے دماغ
تجھکو دیوانوں کا سودا ہے تو آ دیکھ مجھے

درد کا بیتِ جہاں میں ہوں مجسم مضمون
ذوق گر شعر و سخن کا ہے تو آ دیکھ مجھے

شکلِ نیرنگِ جہاں آنکھ میں پھر جائیگی
شوقِ نظارۂ دنیا ہے تو آ دیکھ مجھے

غم مرا دیکھ کے بھولیگی سب اپنی کلفت
تیرے دل کو کوئی صدمہ ہے تو آ دیکھ مجھے

ہیں صعوباتِ سفر دید کے آگے لاشے
گر تجھے چاہ کا دعوےٰ ہے تو آ دیکھ مجھے

وہم ہے۔ خواب ہے۔ دھوکا ہے حیاتِ انسان
تو اگر عاقل و دانا ہے تو آ دیکھ مجھے

لوگ پوچھینگے مری صورت و سیرت تجھ سے
مُنہ کسی کو جو دکھانا ہے تو آ دیکھ مجھے

دیکھ اب سیرِ عدم مدِّ نظر ہے مجھ کو
جینے جی دید مری چاہے تو آ دیکھ مجھے

دیدنی ہے مری کیفیتِ ناگفتہ بہ
گر تجھے شبۂ بے جا ہے تو آ دیکھ مجھے

میری بیوی بیلے خواجہ بانو آخر کے پانچ اشعار کو آجکل بار بار پڑھتی ہیں اور زار و قطار روتی ہیں۔ انکو مرحوم کے ساتھ غیر معمولی تعلق تھا۔ جب یہ نظم انکے پاس آئی تو انہوں نے اسکو معمولی شاعرانہ بات سمجھ کر رکھ دیا۔ اب وہ کہتی ہیں کہ سیرِ عدم کی اطلاع پاکر بھی میں دوبارہ ملنے نہ جاسکی اور حیاتِ انسانی کا دھوکہ سامنے آگیا میں نے سفر کی مشکلات کا بہانہ کیا یا مشکلات بہانہ بنکر میرے سامنے آئیں مگر افسوس محبت نے میری کچھ مدد نہ کی۔ ورنہ دیدِ مزید کی حسرت دل میں نہ رہتی۔ میں مرحومہ سے صرف ایک بار بھیکم پور جاکر ملی تھی پھر کبھی وہاں جانا ممکن نہ ہُوا۔

خواجہ بانو کہتی ہیں مرحوم کے بہت سے خط میرے پاس ہیں اگر مرحوم کے عزیزوں نے نامناسب نہ جانا تو میں ان کی نظرثانی کرکے شائع کرادونگی کیونکہ ہر خط درسِ حکمت اور تغیراتِ عالم کے سبق کا خزانہ ہے۔

حسن نظامی

جذباتِ عالیہ

گرامی

شبہائے وصل و گوشۂ چشمِ عنایتے
مائیم و زلفِ یار و مسلسل حکایتے

ہاں وا رسی بہ نکتۂ مضمونِ باغِ خلد
خوانی اگر ز مصحفِ رخسار آیتے

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما
ایں را نہایتے ست نہ آں را نہایتے

از صبر و شکر نے سخنے نے ترانۂ
الّا چکد ز حضرتِ انسان شکایتے

عنوانِ یک نگاہ تو آشوبِ عالمے
تمہیدِ نیم خندِ تو مرگِ ولایتے

عقلِ بہانہ جو سپر افگند و رم گرفت
در عرصۂ کہ عشق علم کرد رایتے

تا چند امتحانِ تغافل تبسمے
دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

مرزا محمد ہادی

صورتیں اُمید کی خوابِ پریشاں ہوگئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں

راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہوگئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہوگئیں

بے مروت سی جو قبریں کوچۂ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہوگئیں

پنجۂ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں

کچھ دنوں واعظ نے جن کا خود کیا تھا التزام
اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہوگئیں

کامیابی لذتِ موہوم جب ثابت ہوئی
حسرتیں دل سے نکلتے ہی پشیماں ہوگئیں

اُن سے کیا لطفِ تعلق اُن سے کیا دل بستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہوگئیں

ہم سے پوچھے بھی کوئی تو کیا کہیں کیا چاہیے
خواہشیں بیتابئ دل سے پریشاں ہوگئیں

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سُنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہوگئیں

عبدالحی صدیقی

محو ہوں لُطفِ نازہیں تیرے
گُم ہوں راز و نیاز ہیں تیرے

میری ہستی مٹا چکا ہے عشق
حُسنِ ہستی نواز ہیں تیرے

یہ فریبِ نظر۔ معاذ اللہ
جلوۂ پردہ ساز ہیں تیرے

چشمِ نظّارہ محوِ حیرت ہے
حُسنِ نیرنگ ساز ہیں تیرے

شانِ تسخیرِ عالمِ جاں ہے
لُطفِ بندہ نواز ہیں تیرے

اُف۔ یہ عالم فریبیاں ظالم!
حُسنِ عالم طراز ہیں تیرے

کُشتۂ مشقِ ناز ہیں لاکھوں
عرصۂ ترکتاز ہیں تیرے

ناظر

حضرت ہمایوں مرحوم کی سیر کشمیر کے موقعہ پر پنجاب کے مشہور شیوا بیان خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اشعار ذیل فی البدیہہ ارشاد کئے تھے اس مجلس میں آنریبل سر محمد شفیع بھی شریک تھے مقطع میں اسکی طرف اشارہ ہے (ب)

راز نہاں کسی سے اپنا عیاں نہ کرتے — اے کاش دل کو اہلِ زباں نہ کرتے

گر بوالہوس نہ کرتے دعوائے عشقبازی — وہ اپنے عاشقوں کا یوں امتحاں نہ کرتے

گر جانتے جوانی ہے ایک نقشِ فانی — یہ فخر و لن ترانی یوں نوجواں نہ کرتے

گر جانتے کہ غم سے ممکن نہیں رہائی — راحت کی ہاں تمنا ہم رائگاں نہ کرتے

اُس دلربا کو لایا پھر طالعِ ہمایوں — ہم نقدِ جان و دل کو کیوں ارمغاں نہ کرتے

رندوں کی انجمن میں گر محتسب نہ آتے — اس طرح میکشی کی رمزیں بیاں نہ کرتے

تھا آفتابِ محشر نظارہ سوز ناظر
سر پر شفیعِ عالم گر سائباں نہ کرتے

بیخود

اسکو بھی ڈھونڈھتے ہیں اپنی بھی جستجو ہے — اک وہ بھی ہے تمنا اک یہ بھی آرزو ہے

جس سے مہک رہا ہے باغِ جناں وہ تو ہے — پھولوں کو کون سونگھے ان میں خودی کی بو ہے

جو سب کو چھوڑ بیٹھا عاشق ترا وہی تھا — کہتے ہیں لوگ جسکو جانِ جہاں وہ تو ہے

کیا کر دیا یہ جادو آنکھوں میں بس گیا تو — ہم جسکو دیکھتے ہیں تجھ سا ہی ہو بہو ہے

موسےٰ کے ہوش کھو کر ٹھیرا وہاں نہ دم بھر — پاس آکے دور رہنا مدت سے تیری خو ہے

ہر سمت روشنی سی پھیلی ہوئی ہے کیسی؟ — پردہ سے جلوہ افگن کس کا رخِ نکو ہے

جس دل میں درد پایا اپنا اسے بنایا — معشوق کی نظر میں عاشق کی آبرو ہے

ظاہر میں ہے خدا تو باطن میں دلربا تو — یہ بھی ہے شان تیری اُس شان میں بھی تو ہے

جامِ مراد بھر دے یکسو مجھے بھی کر دے — شہرہ ترے کرم کا دنیا میں چارسو ہے

آئینہ میں ہویدا ہے عکس آئینہ کا — میں اُسکے روبرو ہوں وہ میرے روبرو ہے

غنچہ جو کوئی چٹکا بلبل نے دل میں سمجھا — پردے کا ہے وہ عادی پردے میں گفتگو ہے

عصیاں پسند مجھ سا آمرزگار تجھ سا — دنیا میں میں ہی میں ہوں عقبیٰ میں تو ہی تو ہے

بیخود شراب پینی عادت نہیں ہے تیری — ہم تجھ کو جانتے ہیں مستِ الست تو ہے

تاجور

وجہ بربادیٔ دل عشقِ فسوں ساز نہ ہو — صاحبِ خانہ کہیں خانہ برانداز نہ ہو

ضبطِ فریاد سے ہو جائیں نہ آنکھیں پُرنم — پردہ داری ہی کہیں پردہ درِ راز نہ ہو

روح پرواز کریگی قفسِ عنصر سے — نہیں بلبل میں اگر طاقتِ پرواز۔ نہ ہو

صدرِ محفل نہ ہو تو ہی کہیں اُس محفل میں — بزمِ محشر بھی تری انجمنِ ناز نہ ہو

دل میں رکھ لیجئے اُس دل کو جو سوزِ غم سے — صفتِ شمع پگھل جائے اور آواز نہ ہو

ہوک سی اُٹھنے لگی دل میں خدا خیر کرے — جس کا انجام نہیں یہ وہی آغاز نہ ہو

تاجور! ترکِ محبت کی قسم ٹوٹ نہ جائے — وہ فسوں سازِ کج انداز۔ در انداز نہ ہو